www.urducouncil.nic.in

ستمبر 2017 قیمت:- /10₹

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

نئی دہلی

Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ اردو دنیا

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہنامہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھیے: اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سیمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 15 روپے، سالانہ: 150 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیش کش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو نئی سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندوستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066 فون: 26109746 فیکس: 26108159

E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

بچوں کی دنیا

جلد: 5 شمارہ: 9 ستمبر 2017

اس شمارے میں

مدیر کا خط	آپس کی باتیں		04
ڈاک کی باتیں	ڈاک خانہ		05
یوم اساتذہ	استاد محترم	ذاکرہ الماس ضیا	06
	بچوں پر بڑے کا اثر	محمد کلیم	09
	استاد	اختر جمال پوری	11
	علم	شاہد عظمی صدیقی	12
مضامین	مچھر	شمس الاسلام فاروقی	13
	سیٹی	مصطفیٰ ندیم خان غوری	15
	پلاسی	شمیم طارق	18
	[illegible] ایک عظیم سائنس داں	محمد ناہد	20
نظم	وہ پیڑ لگاتے ہیں	فریاد آزر	22
کہانیاں	نیا سبق	اکرم رحمی	23
	نیم حکیم	مشتاق اعظمی	24
	دوستی	محمد سراج عظیم	25
	[illegible]	محمد شمیم	28
	آب حیات	سراج فاروقی	30
بچوں کا کتب خانہ	علمی باتیں	ظہیر ابرار	33
باتصویر کہانی	ایک دکھ بھری کہانی	اقبال برکی	35
قسط وار ناول	آسیب کا ہاتھی	شکیل صدیقی	39
کہکشاں	اچھا استاد	عمیر ابن شیخ خلیل	50
	کچھ اہم معلومات	انصاری محمد انس محمد حسین	50
	بڑے لوگ بڑی باتیں		51
	مسکاتی کلیاں	عطاء الکریم	53
	سنہرے اقوال	محمد عمران خان	53
	[illegible]	محمد اکرم ظہیر	54
	ماں	فوزیہ [illegible]	55
	آؤ ڈرائنگ سیکھیں		56
ننھے فنکار	فراست کا انعام	محمد علی	58
	بچوں کی پینٹنگ		60
آپ کی بات	اردو کا [illegible]		62

مدیر: پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، ایف سی-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،

جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49539000

شعبہ ادارت: 49539009-11

ای میل

bachonkiduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

قیمت: /10 روپے سالانہ: /100 روپے

• اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

بچوں کی دنیا کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL شعبہ فروخت کے پتے پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

شعبہ فروخت

ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم

نئی دہلی-110066

فون: 26109746

ای میل: sales@ncpul.in

ncpulsaleunit@gmail.com

علاقائی مرکز: 22-7-110، قمر ڈاکس، ساجد پارکنگ کمپلیکس

بلاک نمبر 5-1، چھتہ بازار، حیدرآباد-500002

فون: 040-24416194

آپس کی باتیں

پیارے دوستو! ستمبر کا شمارہ حاضر ہے۔ آپ سب جانتے ہیں کہ یہ مہینہ ہم سب کے لیے اس لیے خاص ہے کہ اس ماہ کی 5 تاریخ کو یوم اساتذہ کے طور پر منایا جاتا ہے۔ 5 ستمبر ہمارے ملک کے دوسرے صدر اور مشہور ماہر تعلیم ڈاکٹر رادھا کرشنن کا یوم پیدائش ہے۔ اس دن تمام اسکولوں اور کالجوں میں تقریبات منعقد ہوتی ہیں اور استاد و شاگرد ایک دوسرے کو تحائف دیتے ہیں مگر یہ دن محض تحفے دینے کا یا اپنے استاد کی تعریف کرنے کا نہیں ہے۔ یہ دن شاگردوں کے ساتھ ساتھ اساتذہ کو بھی ان کے فرائض کی یاددہانی کراتا ہے کہ انھوں نے اپنا کام بحسن وخوبی انجام دیا یا نہیں؟ تدریس کا فریضہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اسی عمل پر بچوں کے مستقبل کا انحصار ہے۔ اساتذہ اپنے شاگردوں پر جتنی محنت کرتے ہیں اتنا ہی طالب علموں میں نئے امکانات کی تلاش کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے اساتذہ کو چاہیے کہ تمام بچوں پر خاص دھیان دیں اور ایسا ماحول بنائیں کہ بچے بے خوف ہو کر اپنے اساتذہ سے سوالات کر سکیں۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی بچہ پڑھنے میں کمزور ہے تو اس پر کم توجہ دی جائے، بلکہ وہ زیادہ توجہ کا مستحق ہے۔

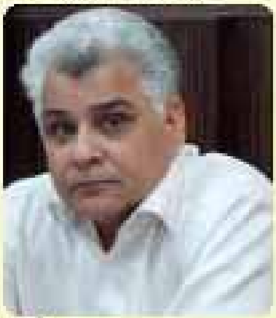

آج کے دور میں مخلص اساتذہ کی کمی ہے۔ پرانے زمانے میں اساتذہ طلبہ پر خصوصی دھیان دیتے تھے اس لیے اس وقت کے طلبا کو کوچنگ کی ضرورت نہیں پڑتی تھی مگر اب ملک میں کوچنگ سنٹروں کا رواج چل پڑا ہے جہاں سے اساتذہ کو اسکولوں اور کالجوں کے علاوہ اچھی کمائی ہو جاتی ہے اور وہ وہاں زیادہ سنجیدگی سے کام بھی کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اسکولوں میں وہ بچوں کو کوچنگ میں داخلہ لینے کے لیے بھی کہتے ہیں۔ ایسے اساتذہ اپنے فرائض منصبی سے کوتاہی برت رہے ہیں اور یقیناً یہ صحت مند معاشرے کے لیے بہتر نہیں ہے۔ بچے ہمارے ملک کا اثاثہ ہیں اور ان کی صحیح تعلیم و تربیت کرنا ہم سب کا فرض ہے۔ اس پر نہ صرف اساتذہ بلکہ والدین کو بھی دھیان دینے کی ضرورت ہے کہ ان کا بچہ اسکول کے بعد کہاں جاتا ہے، کس سے ملتا ہے، کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور موبائل پر کتنا وقت ضائع کرتا ہے اور کن کاموں میں اس کی زیادہ دلچسپی ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ مہنگے اسکولوں اور بہتر اسکولوں میں داخلہ کرا کر ہم اپنے فرض سے غافل ہو جائیں۔ بلکہ ہمیں اپنے بچوں کے روزمرہ کے معمولات پر بھی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

آج سے پچاس ساٹھ برس قبل اساتذہ کی تنخواہیں کم تھیں لیکن انھیں معاشرے میں اونچا مقام حاصل تھا۔ آج اساتذہ کی کمائی لاکھوں میں ہے لیکن وہ طالب علم کی امیدوں پر کھرے نہیں اترتے۔ ایسا کیوں ہے کہ آج استاد اور شاگرد کے درمیان جو پاکیزہ رشتہ تھا وہ ختم ہوتا جا رہا ہے اور اس پیغمبری پیشے نے کاروبار کی شکل اختیار کر لی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ استاد اپنے فرائض کو سمجھیں اور معاشرے کو تعلیم یافتہ بنانے کے لیے جوش و لگن اور سنجیدگی سے کام کریں۔ ایک بچے کو کامیاب بنانے میں اچھے استاد کا بہت بڑا کردار ہوتا ہے اور ایسے استاد کی ہمیشہ قدر کرنی چاہیے۔ یہاں ایک اور بات کی طرف دھیان دلانا ضروری ہے کہ آپ سب کے ایسے استاد بھی ہوں گے جو ریٹائر ہو چکے ہیں یا جو ضعیف ہو چکے ہیں انھیں آپ کبھی فراموش نہ کریں۔ بلکہ موقع ملے تو ان سے ملنے اور استفادے کی کوشش کریں۔ اس سے آپ کی معلومات میں بھی اضافہ ہوگا اور آپ کے اساتذہ کو بھی خوشی ہوگی۔

بچوں کی دنیا میں یوم اساتذہ کے حوالے سے بھی کچھ تحریریں شامل کی گئی ہیں۔ ساتھ ہی معلوماتی مضامین اور دلچسپ کہانیاں اور نظمیں ہیں جو آپ کو پسند آئیں گی۔ اپنے تاثرات سے آگاہ کرنا نہ بھولیں۔ ہمیں آپ کے خطوط کا انتظار رہتا ہے۔

آپ کا

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

ڈاک خانہ

گذشتہ تین سال سے 'بچوں کی دنیا' پڑھ رہے ہیں اور حیران ہیں۔ یقیناً کسی اور ہندوستانی زبان میں بچوں کے لیے ایسا میگزین میں نے نہیں دیکھا۔ جون جولائی کے شمارے معیاری، سائنسی مضامین لے کر آئے تھے۔ محمد اکمل خاں کا 'وقت کی قدر کریں' یادر ہے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وقت کی بات کرنے کے لیے دھوپ گھڑی یعنی Sun dial کا ذکر بھی نہ ہوگا بلکہ آؤ دھوپ گھڑی بنائیں۔ معروفیت کے لیے تجویز کی جاسکتی ہے۔ ہمارے امرتسر کے دربار صاحب Golden Temple میں ایک دھوپ گھڑی قدیم زمانہ سے موجود ہے اور چل رہی ہے۔

پروفیسر موہن سنگھ (ریٹائرڈ)، خالصہ کالج، امرتسر

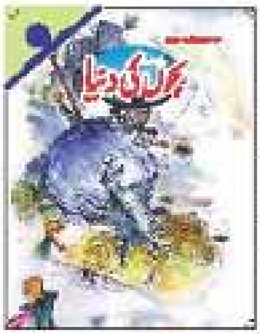

'بچوں کی دنیا' کے لیے میں اس سے پہلے بھی خط لکھ چکی ہوں اور اپنا خط رسالہ میں دیکھ کر مجھے بہت زیادہ خوشی ہوئی تھی۔ رسالہ کے پرکشش و جاذب مضامین، نظمیں، کہانیاں و دیگر موضوعات نے مجھے پھر سے خط تحریر کرنے پر آمادہ کر ہی لیا... ابھی فی الحال تو ماہ جون و جولائی کا رسالہ میرے ہاتھ میں ہے۔ ماہ جون میں شروع کردہ ناول 'زمین کی تہہ میں' مجھے عجیب و غریب اور پراسرار دنیا میں چھوڑ آیا ہے یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ مانو پروفیسر لائڈین بروک اور البرٹ کے ساتھ میں بھی یہ سفر کر رہی ہوں! آپ یقین نہ کریں کتاب کھولتے ہی ایسا لگتا ہے جیسے میں کسی خوبصورت سی دنیا میں آگئی ہوں۔ میں خود محسوس کر رہی ہوں کہ یہ رسالہ ہماری سوچ کو مثبت راہ کی جانب تیز سوچ کا دائرہ بڑھانے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

صبا منیر، مولانا آزاد کالج، روضہ باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

آج سے تقریباً دو سال پہلے رسالہ 'بچوں کی دنیا' Good Faith Welfare Society کے روح رواں خیر البشر محلہ کوٹ قصبہ مؤائمہ ضلع الہ آباد یوپی کے بدست ملا تھا تو مجھے یہ رسالہ بہت پسند آیا۔ میں نے ابو سے کہا ہر مہینہ بچوں کی دنیا لایئے مجھے یہ بہت پسند ہے سب رسالوں سے زیادہ۔

محمد مصعب انصاری، محلہ کوٹ قصبہ مؤائمہ ضلع الہ آباد

تقریباً دو سال قبل 'بچوں کی دنیا' جب میں نے اپنے صاحب زادے کو دیا تو وہ گرویدہ ہوگیا بولا یہ رسالہ ضرور لایا کریں۔ میرا بچہ ہر ماہ 'بچوں کی دنیا' کا مطالعہ کرتا ہے۔

مولانا محمد عادل ندوی، پونہ، مہاراشٹر

شاہین فاطمہ زیبا

انمول تحفہ

اسمبلی کے بعد حسبِ معمول زیبا جماعت میں داخل ہوئی۔ تمام طلباء نے اٹھ کر سلام کیا، زیبا نے مسکراتے ہوئے سلام کا جواب دیا ساتھ ہی بیٹھنے کو کہا اور حاضری رجسٹر نکال کر تمام طلبا کے رول نمبر سے حاضری لینی شروع کی، رول نمبر 20 کہہ کر جواب نہ آنے پر اس نے سامنے دیکھا اس کی نظریں جماعت کے طلباء میں شہباز کو ڈھونڈنے لگی، اس نے اشفاق کو جو کہ شہباز کا دوست تھا اور اس کے گھر کے قریب بھی رہتا تھا، اپنے پاس بلایا اور شہباز کے نہ آنے کی وجہ پوچھی اس پر اشفاق نے کہا کہ وہ بہت بیمار ہے اور اس کی وجہ سے وہ اسکول نہیں آیا۔

شہباز کی بیماری کا سن کر زیبا بہت بے چین ہو گئی اس نے اشفاق سے اسکول چھٹنے پر شہباز کے گھر ساتھ چلنے کو کہا۔ آج اُس کا دل بالکل نہیں لگ رہا تھا جیسے تیسے اُس نے طلباء کو بورڈ پر سوالات کے جوابات لکھائے، ہوم ورک دیا اور چھٹی ہونے کا بے صبری سے انتظار کرنے لگی۔ بھولا بھالا معصوم سا سب کا چہیتا شہباز اپنی جماعت میں سب سے زیادہ ذہین سب کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والا اور تمام ٹیچرز میں زیبا کو سب سے زیادہ چاہنے والا شہباز آج بیمار پڑا ہے۔

اُسے یاد آیا کہ پچھلے چند ہفتوں پہلے وہ بیمار ہو گئی تھی جس کی وجہ سے اس نے اسکول سے پندرہ دن کی چھٹی لے رکھی تھی، مگر چھٹی کے دوسرے ہی دن شہباز اپنے دوستوں کے ساتھ اس کی طبیعت دیکھنے آگیا تھا اور اس کے ہاتھوں میں بسکٹ کا ایک پیکٹ بھی تھا، سلام کر کے بسکٹ کا پیکٹ اس نے زیبا کے قریب رکھ دیا تھا اور بڑے ادب سے بیٹھ کر زیبا کی طبیعت کے بارے میں پوچھا تھا اور کہا تھا باجی آپ جلدی سے اچھے ہو جائیں گے ہم سب بچے آپ کے لیے دُعا کر رہے ہیں اور پھر آپ جلدی سے اسکول بھی آجانا۔

شہباز کی ہمدردانہ باتیں سُن کر زیبا کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے اور اس نے تمام سے وعدہ کیا کہ وہ جلد ہی اسکول

ضروری خانہ پُری کرنے کے بعد شہباز اوراُس کی والدہ کو پرائیویٹ روم دیا گیا. زیبا نے کاؤنٹر پر فیس اوردوائی وغیرہ کا بل ادا کیا. پاس کی کینٹین سے کھانا اورشہباز کے لیے دودھ منگوایا اورکچھ روپے شہباز کی والدہ کے پاس دے کر کہا کہ کسی بھی طرح کی کوئی ضرورت ہو تو مجھے فوراً فون کردینا. اپنافون نمبر اُن کے حوالے کرکے شہباز کا دھیان رکھنے کو کہا شہباز کی طرف دیکھا شہباز ویسے ہی بے سُدھ سویا ہوا تھا. وہ شہباز کے قریب گئی اُس کے گال پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور دوسرے دن آنے کاوعدہ کیا اوراپنے گھر کی راہ لی.

آجائے گی۔شاید اللہ تعالیٰ نے ان معصوموں کی سُن لی تھی، وہ جلد صحت یاب ہونے لگی اوراس نے پھر سے اسکول جانا شروع کردیا تھا اورآج شہباز کی بیماری کا سُن کر اُسے بہت افسوس ہوا۔

جیسے ہی اسکول کی گھنٹی بجی اُس نے جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹا گھر والوں کوفون پر بتلایا کہ وہ شہباز کودیکھنے اُس کے گھر جارہی ہے، اشفاق کوساتھ لے کروہ شہباز کے گھر پہنچی ،گھر کیا تھا گھر کے نام پر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا، جس میں شہباز کے ساتھ اس کی والدہ رہتی تھی اُس کے والد کا انتقال بچپن ہی میں ہوگیا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی سامنے پلنگ پر شہباز نیم بیہوشی کی حالت میں لیٹا ہوا تھا، اُس کے قریب ہی شہباز کی والدہ بیٹھی ہوئی کافی پریشان سی لگ رہی تھی، اُنہوں نے جیسے ہی زیبا کودیکھا وہ رونے لگی، زیبا نے اُنھیں تسلی دی اور شہباز کی طبیعت کے بارے میں دریافت کیا اس پر شہباز کی والدہ نے بتلایا کہ کل شام ہی سے اُسے بخار آگیا تھا اسی وجہ سے وہ آج اسکول نہیں آیا۔

زیبا نے شہباز کے ماتھے کو چھو کر دیکھا واقعی شہباز کو کافی بخار تھا، شہباز کی والدہ نے مزید کہا کہ میں نے قریب کی میڈیکل اسٹور سے بخار کی گولیاں بھی کھلائی مگر اس کا بخار نہیں اتر رہا ہے، اس پر زیبا نے کہا کہ کوئی بات نہیں ہم ابھی اسے دواخانے لیے چلتے ہیں، اس نے اشفاق کو پیسے دے کر کہا کہ وہ رکشہ لے آئے، رکشہ آنے پر وہ تینوں زیبا کے فیملی ڈاکٹر کے پاس پہنچے۔

ڈاکٹر نے شہباز کا معائنہ کیا اور فوری اُسے شریک کروانے کے لیے کہا اور زیبا سے کہا کہ اچھا ہوا تم اسے لے آئی ورنہ حالت اور بگڑ سکتی تھی۔

ضروری خانہ پُری کرنے کے بعد شہباز اور اس کی والدہ کو پرائیویٹ روم دیا گیا، زیبا نے کاؤنٹر پر فیس اور دوائی وغیرہ کا بل ادا کیا، پاس کی کینٹین سے کھانا اور شہباز کے لیے دودھ منگوایا اور کچھ روپے شہباز کی والدہ کے پاس دے کر کہا کہ کسی بھی طرح کی کوئی ضرورت ہو تو مجھے فوراً فون کردینا، اپنا فون نمبر اُن کے حوالے کر کے شہباز کا دھیان رکھنے کو کہا، شہباز کی طرف دیکھا شہباز ویسے ہی بے سُدھ سویا ہوا تھا۔ وہ شہباز کے قریب گئی اُس کے گال پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور دوسرے دن آنے کا وعدہ کیا اور اپنے گھر کی راہ لی۔

گھر پہنچ کر بھی وہ شہباز کے بارے میں سوچتی رہی اور دل ہی دل میں اُس کے اچھا ہونے کی دعائیں بھی کرتی رہی، لگاتار دو تین دن تک وہ برابر شہباز کو دیکھنے دواخانے جاتی رہیں، چوتھے دن وہ اسکول کے وقت سے ایک گھنٹہ پہلے گھر سے نکل کر دواخانے پہنچی، اُسے یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ شہباز آج اُٹھ کر بیٹھا ہوا ہے، سامنے اس کی والدہ بیٹھی اُسے پھل کھلا رہی تھی۔

شہباز کی نظر جیسے ہی زیبا پر پڑی وہ ہمت کر اُٹھنے کی کوشش کرنے لگا مگر زیبا نے اُسے ایسا کرنے سے منع کر دیا اور اس کی طبیعت کے بارے میں پوچھا، شہباز نے بتایا کہ وہ بہت اچھا محسوس کر رہا ہے، اس نے شہباز کے ماتھے پر ہاتھ رکھا بخار بالکل اُتر گیا تھا، زیبا نے بڑی راحت کی سانس لی، اتنے میں ڈاکٹر صاحب بھی وہاں آ گئے اور انھوں نے شہباز کو چیک کیا، چیک کرنے کے بعد اُسے گھر جانے کی اجازت دے دی مگر دوا برابر پابندی سے کھانے کی اور آرام کرنے کی نصیحت کی، اس پر شہباز نے ہاں میں سر ہلایا۔

زیبا نے ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا اُن کی فیس اور دواخانے کا بل ادا کیا، شہباز اور اس کی والدہ کو رکشہ منگوا کر اُن کے گھر چھوڑنے گئی، شہباز کی والدہ گھر پہنچتے ہی رو پڑی اور وہ روتے ہوئے بار بار زیبا سے یہی کہتی تھی کہ آپ بہت اچھی ہیں آپ شہباز کے لیے فرشتہ بن کر آئی ہیں، آپ بہت اچھی ٹیچر ہیں، شہباز بھی احسان مند نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا، زیبا کی آنکھیں بھی یہ منظر دیکھ کر بھر آئیں، زیبا نے شہباز کی والدہ کو سمجھایا کہ اب تو شہباز بالکل ٹھیک ہو گیا ہے اور شہباز سے کہا کہ دوا وقت پر کھاؤ اور اپنی صحت کا خیال رکھو اور جلدی سے اسکول آ جاؤ۔

زیبا کے اسکول کا وقت ہو گیا تھا وہ شہباز کی والدہ سے اجازت لے کر اسکول کے لیے نکل پڑی، آج وہ بہت سکون محسوس کر رہی تھی، اسے لگ رہا تھا کہ جیسے دل پر کوئی بوجھ تھا جو اُتر گیا ہو، وہ پوری طرح سے مطمئن ہو گئی تھی۔

اسکول پہنچ کر وہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی وہ اشفاق سے شہباز کی طبیعت کے بارے میں معلومات لیتی رہی اور آج حسبِ معمول جماعت میں داخل ہوئی چاروں طرف نظریں دوڑائی مگر شہباز نظر نہ آیا اُس نے سوچا شہباز تو اب تک بالکل ٹھیک ہو گیا ہوگا، اب تک اُسے آ جانا چاہیے تھا۔ وہ یہ باتیں سوچ ہی رہی تھی کہ اُسے جانی پہچانی آواز سنائی دی، شہباز اُس سے جماعت میں اندر آنے کی اجازت طلب کر رہا تھا، وہ فوراً اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی اُسے اندر آنے کو کہا، زیبا نے دیکھا کہ شہباز کے ہاتھ میں پھولوں کا گلدستہ ہے، شہباز نے گلدستہ زیبا کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے کہا "ہیپی ٹیچر ڈے مس"، تمام طلباء نے تالیاں بجائی، شہباز کے ہاتھوں سے گلدستہ لیتے ہوئے زیبا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کی زندگی کا یہ سب سے اچھا اور انمول تحفہ ہے، اُس نے آگے بڑھ کر شہباز کی پیشانی کو چوما اُس سے ہاتھ ملا کر تھینک یو کہا۔

شہباز کی بیماری میں اُسے یہ یاد ہی نہیں رہا کہ آج ٹیچر ڈے ہے اور وہ سوچنے لگی کہ ٹیچر ڈے کے موقع پر اس سے بڑا انعام اُس کے لیے اور کیا ہو سکتا ہے اور پھر سے پہلے کی طرح پورے جوش و خروش کے ساتھ طلباء کو پڑھانے میں مصروف ہو گئی۔

■

Dr. Shaheen Fatima
Plot. No.: 13, Basheer Colony
Roshan Gate
Aurangabad (Maharashtra)

محمد وکیل

'ٹیچرس ڈے' کا تقدس

بچو! ٹیچر (استاد) کا مرتبہ اتنا ہی عظیم ہے جتنا کہ دنیا میں 'ماں' کا مرتبہ ایک اولاد کے لیے ہے اسی طرح معلم کے لیے بھی 'استاذ' کا درجہ اسی قدر عزت اور مرتبے کا حامل ہے۔ اگر شخصیت پرستی کی اجازت ہوتی تو شاید اللہ رب العزت ہمیں اپنے والدین کے بعد اپنے اپنے استاد کی پرستش کی اجازت دیتا۔ آج ہر کامیاب انسان اپنے استاد کی وجہ سے ہی کامیابی کی منزل پر ہے۔ اگر استاد نہ ہوتے تو شاید سیکھنے، سکھانے کی دولت حاصل کرنے سے انسان محروم ہوتا اور پھر شاید تہذیب اور آداب زندگی کے بغیر انسان، انسان نہیں بلکہ غیر تہذیب یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے 'انسان' ہونے کے شرف سے محروم ہوتا۔

استاد کے مرتبے کو کسی ہندی شاعر نے یوں بیان کیا ہے:

"میرے سامنے استاد اور بھگوان دونوں موجود ہوں تو میرے لیے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ پہلے کس کی پابوسی کروں۔"

بھارت کے سابق صدر جمہوریہ سرو پلی ڈاکٹر رادھا کرشنن کی پیدائش 5 ستمبر کو ہونے کی وجہ سے ہی پورے بھارت میں ان کے نام سے یہ دن منایا جاتا ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے ایک استاد کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ اپنی تعلیم کی وجہ سے ہی وہ ملک کے سب سے بلند مقام تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ اونچے مقام پر پہنچ کر بھی انھوں نے استاد کی خدمات کو مقدم اور اہم سمجھتے ہوئے اپنی پیدائش کی تاریخ پر اپنی سالگرہ نہ منا کر 5 ستمبر کو اساتذہ کے نام سے منسوب کر کے اس دن کو 'ٹیچرس ڈے' منانے کی داغ بیل ڈال کر رادھا کرشنن نے رہتی دنیا تک اساتذہ کو ایک عظیم شخصیت کا خطاب عطا کر کے درس و تدریس کے عمل کو یادگار اور بامراد بنا دیا۔

دراصل 5 ستمبر اس مرتبے کے جشن کا دن ہے اور اساتذہ کے احتساب کا دن بھی ہے۔ 5 ستمبر کی تاریخ ہر سال آتی ہے۔ یہ تاریخ محاسبہ کرنے کی ہے۔ استاد کو اپنے مرتبے اور اپنی ذمہ داری اور طلبا کو اپنی حد اور اپنے فرائض کا خیال رکھنا ہوگا۔ دونوں سے اگر ذرا سی بھی چوک یا لغزش ہوئی تو یہ نازک رشتہ شیشہ کی طرح چکنا چور ہو جائے گا۔

بچو! یقیناً آپ سب طالب علم ہوں گے۔ آیئے میں آپ کو چند نیک اور اہم باتیں بتاؤں، جن پر عمل کر کے آپ اساتذہ کی نظروں میں پسندیدہ طالب علم بننے کی سعادت حاصل کر سکتے ہیں۔

(1) اگر ٹیچر کسی معقول وجہ سے آپ پر سختی کریں تو ان کی طرف سے بدظن، خفا اور تنگ ذہن نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ ایسا وہ آپ کی اصلاح کی غرض سے کرتے ہیں۔ بڑے ہو کر آپ ان کی اس محبت آمیز سختی کی اہمیت اور فضیلت سمجھ سکیں گے۔

(2) اگر کلاس میں ٹیچر ہوم ورک دیں تو پابندی سے اسے حل کر کے لانے کی عادت سے آپ کے اندر نہ صرف وقت پر اپنا کام انجام دینے کی عادت ہو جائے بلکہ اس عمل سے آپ کے ٹیچر آپ کو مزید ورک دے کر آپ کی ذہانت اور کارکردگی کو بہتر بنانے میں مددگار ثابت ہوں گے۔

(3) جب تک استاد کلاس میں موجود ہوں، بغیر اجازت کلاس سے باہر جانے کی بھول نہیں کرنی چاہیے۔ استاد کا احترام ماں، باپ کا احترام کرنے کے برابر ہے۔ اللہ ایسے طالب علموں سے خوش رہتا ہے اور اس کے علم میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔

(4) اگر استاد کی کوئی بات ناگوار معلوم ہو تو خاموشی سے سن کر ادب کی مثال پیش کرنا چاہیے۔ بہت ممکن ہے اس میں آپ کی بہتری چھپی ہو۔

(5) آج کل کے زمانے میں بیمار کے گھر جا کر اس کی مزاج پرسی اور عیادت کا رجحان ختم ہوتا جا رہا ہے، جبکہ بیمار کو دیکھنے کی عادت بنی رہنی چاہیے کیونکہ اللہ بیمار کی عیادت کرنے والوں کو محبت اور پسندیدہ نظروں سے دیکھتا ہے۔ آپ بھی اپنے بیمار اساتذہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں میں مددگار بن کر آئندہ نسل کے لیے ترکیب و ترغیب کا سبب بن سکیں گے۔

(5) اپنے استاد کے خلاف کوئی بات سنے تو اسے ایسا کہنے سے منع کرے اور اس کی کاٹ کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔

(6) ایک آخری لیکن انتہائی اہم عمل آپ کا یہ بھی ہونا چاہیے کہ آپ اپنی دعاؤں میں جس طرح اپنے والدین، رشتہ دار، دوست اور پڑوسی کے لیے دعائے عافیت کرتے ہیں اسی طرح آپ پر ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ آپ اپنے تمام زندہ اور مرحومین استاد کے لیے عافیت اور مغفرت کی دعا کریں کیوں کہ اللہ خود کہتا ہے کہ انسان کو اپنی دعاؤں میں اپنے استاد کو شامل کرنا چاہیے کہ انسان کا مکمل وجود والدین اور استاد دونوں کی محنت اور نگہداشت کا نتیجہ ہے۔

اُمید ہے کہ آپ آج سے ہی اپنے استاد کو بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں گے۔

■

Md. Wakeel Ahmed (Wakeel Aleemi)
H/O 5,P.O: Kankinara
North 24, Parganas - 743126 (WB)

استاد

مکتب میں جو پڑھنے کو اک بار اگر آئے
ظلمت کے اندھیروں میں ضوبار نظر آئے

سن لے گا خدا پہلے معصوم صداؤں کو
جو دستِ دعا لے کر اللہ کے گھر آئے

قسمت کا ستارہ بھی ہوتا ہے بلندی پر
استاد کی باتوں کے جو زیرِ اثر آئے

وہ لوگ نہ بھٹکیں گے منزل سے کبھی اپنی
جو درسِ وفا لے کر ہر شام سحر آئے

جو لوگ سمجھتے ہیں استاد کی عظمت کو
اُن لوگوں کی قسمت میں سب لعل و گہر آئے

ماں باپ کی شفقت کا ہوتا ہے کرم اُن پر
وہ کوئی بھی مشکل ہو یا کوئی ڈگر آئے

عابد ہوں کہ زاہد ہوں پڑھنے میں جو کاہل ہیں
آتا ہے نتیجہ تو ہر بار صفر آئے

ہوجائے گا حل اُن کی تعلیم کا مقصد بھی
جو سیکھ کے مکتب سے وہ علم و ہنر آئے

معمور نہیں سینہ جو علم کی دولت سے
بھٹکیں گے وہ راہوں میں سایہ نہ شجر آئے

اس دورِ سیاست میں آگے وہی بڑھتا ہے
فولاد کا سینے میں جو لے کے جگر آئے

پھولوں کی طرح اختر وہ لوگ مہکتے ہیں
تہذیب کے گلشن کا جو کرکے سفر آئے

■

Akhtar Jalalpuri
Qazi Pura Jalalpura
Ambedkar Nagar - (UP)

علم

دین و دنیا کی بھلائی علم سے
دور ہوتی ہے برائی علم سے

شخصیت کی خوشنمائی علم سے
دل کی ہوتی ہے صفائی علم سے

علم ہی کا نام تو سائنس ہے
ہاتھ میں ہے سب خدائی علم سے

کام ہو جس کا زمانے میں بڑا
زیب کب اس کو رسائی علم سے

جاہلوں کا کچھ نہیں ہے مرتبہ
آدمی کی ہے بڑائی علم سے

ہر بلندی خاص ہے اس کے لیے
جس کسی نے لو لگائی علم سے

قدر ہوتی ہے جہاں بھی جائیے
کھائیے مکھن ملائی علم سے

شاد ہے اپنی طبیعت پہ گراں
ایک لمحے کی جدائی علم سے

Mohd Rafey Shad Azmi
Teacher,Jamia Islamia Muzaffarpur
Azamgarh - 276302 (UP)

شمس الاسلام فاروقی

مچھر

میں ایک بے حد چھوٹا سا کیڑا ہوں۔ میرا سائنسی نام اینوفیلیس (Anopheles) ہے۔ میری ساخت دیکھنے کے لیے آپ کو خوردبین کا سہارا لینا پڑے گا۔ چھوٹا اور بے حد کمزور ہونے کے باوجود میرا راج ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ انسان جو سب سے بڑا ہے وہ مجھ جیسے چھوٹے اور کمزور کیڑے سے بھی اس قدر خوفزدہ ہے کہ مجھے مارنے اور مکمل طور پر ختم کرنے کے طریقے لگاتار سوچتا رہتا ہے۔ دنیا بھر میں نہ جانے کتنے ادارے اور لیبوریٹریز قائم ہیں جہاں ہر سال کروڑوں روپے صرف اس لیے خرچ کیے جاتے ہیں کہ کسی طرح ایسی کوئی ترکیب ہاتھ لگ جائے جو پورے طور پر میرا خاتمہ کر ڈالے۔ مگر اس سب کے باوجود میں آج بھی اس کے قابو سے باہر ہوں۔

میرے چھوٹے سے سر پر دو مرکب آنکھیں اور دو لمبے لمبے انٹینی ہیں جن پر لمبے لمبے بالوں کے گچھے موجود ہیں۔ میرا منہ دیکھیے آپ حیران رہ جائیں گے۔ یہ قدرت کی کاریگری کا ایک نادر نمونہ ہے۔ میرا منہ نیچے کی طرف ایک لمبی سی نوکیلی ٹیوب بناتا ہے جو کسی سیرنج کی شکل کی ہے۔ اس کی ساخت آپ صرف خوردبین کی مدد ہی سے دیکھ پائیں گے۔ بال کی طرح پتلی یہ سرنج بھی چھ عدد باریک ریشوں سے مل کر بنی ہے۔ آپ چاہیں تو خوردبین کے نیچے انھیں الگ الگ کرکے دیکھ سکتے ہیں۔ استعمال کے وقت یعنی جب میں کسی کا خون چوس رہا ہوتا ہوں یہ تمام ریشے آپس میں کچھ اس طرح سختی سے جڑ جاتے ہیں کہ ان سے ایک ٹیوب بن جاتی ہے۔ یہ ٹیوب کھوکھلی ہوتی ہے اور اس کے درمیان ایک پتلی سی نلی رہ جاتی ہے۔ میں خون پینے سے پہلے اس ٹیوب جیسی سیرنج کی نوک کو جو بہت تیز اور دھاردار ہوتی ہے کسی شخص کی جلد میں گھسا دیتا ہوں۔ جب نوک خون تک پہنچ کر اس میں ڈوب جاتی ہے تب میں اپنے منہ کے پچھلے حصے سے اس طرح سانس اوپر کھینچتا

ہوں جیسے آپ اسٹرا کی مدد سے جوس پیتے وقت کھینچتے ہیں۔ ایسا کرتے ہی خون تیزی سے میرے منہ میں جانے لگتا ہے اور اس سے پہلے کہ آپ مجھے مارنے کی تیاری کریں میں خون پی کر تیزی سے آپ کی پہنچ سے دور چلا جاتا ہوں۔

میرے چھوٹے سے سینے کے اوپر دو کے بجائے صرف ایک جوڑی پَر ہیں جن کی مدد سے میں اتنا تیز اڑ لیتا ہوں کہ کسی کے لیے مجھے پکڑنا ممکن نہیں ہوتا۔ میں آواز کرتا ہوا آتا ہوں اور خون پی آواز کرتا ہی ہوا اڑ جاتا ہوں۔ لوگ میری بھن بھن کی آواز سن کر ہی ڈر جاتے ہیں۔ سوتے ہوئے لوگ میری آواز سے ڈر کر اٹھ بیٹھتے ہیں۔ یہ آواز میرے منہ سے نہیں بلکہ پروں سے نکلتی ہے۔ میرے پر اڑتے وقت بہت تیزی سے اوپر نیچے حرکت کرتے ہیں۔ وہ ایک سیکنڈ میں 275 بار اوپر نیچے ہوتے ہیں۔ اتنی تیزی سے حرکت کرنے کی وجہ سے ان سے ٹکرانے والی ہوا آواز پیدا کرتی ہے اور یہی میری آواز بن جاتی ہے۔ سینے میں نیچے کی طرف تین جوڑی پیر ہوتے ہیں جو غیر معمولی طور پر لمبے اور چھوٹے چھوٹے بالوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ ان کی مدد سے مجھے کسی بھی جگہ بیٹھنے اور پھر تیزی سے اڑنے میں مدد ملتی ہے۔

میرا پیٹ بہت لمبا اور پتلا ہے۔ پیٹ کی اندرونی سطح کے خلیوں میں ہی ملیریا یا دیگر بیماریوں کے جراثیم پلتے اور بڑھتے ہیں۔ جب کبھی میں کسی بیمار شخص کا خون چوستا ہوں تو یہ جراثیم میرے منہ میں آجاتے ہیں جو پیٹ اور جگر کے خلیوں میں پہنچ کر بڑھنے لگتے ہیں جب ان کی تعداد بہت زیادہ ہوجاتی ہے تو وہ میرے لعاب کی غدودوں میں داخل ہوجاتے ہیں۔ وہاں سے ان کے لیے کسی بھی صحت مند آدمی کے جسم میں جانا آسان ہوجاتا ہے۔

آپ دیکھ رہے ہیں میں فضاؤں میں اڑتا پھرتا ہوں اور راتوں کو آپ کے گھروں میں گھس کر لوگوں کا خون پیتا ہوں مگر میرے بچے پانی میں رہتے ہیں۔ ہماری مادائیں پانی کی سطح پر انڈے دے دیتی ہیں۔ ان سے نکلنے والے لاروے اور لاروں سے بننے والے پیوپے پانی ہی میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہاں ان کے کچھ دشمن جیسے مچھلیاں یا جھینگروں کے لاروے انھیں اپنی غذا بنا لیتے ہیں اور اس طرح ان کی تعداد خاصی کم ہوجاتی ہے۔ مگر کم تعداد بھی انسانوں کا ناک میں دم کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔

■

Shamsul Islam Farooqui
90-B, Ahata Talib, Noor Nagar
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi - 110025

مصطفیٰ نعیم خان غوری

سیلفی

شام آفس سے واپسی پر ابرار برآمدے میں رکھی آرام کرسی میں دھنس کر نیم دراز حالت میں دن بھر کی تھکان دور کر رہے تھے کہ اتنے شبو کچھ نمکین کے ساتھ ادرک کی گرما گرم چائے کی ٹرے لے آئیں۔ جسے دیکھتے ہی تھکان رفو چکر ہوگئی۔ شام ڈھلتے اشوکا ٹری کے طویل گھنے سایوں میں مگن چائے کی ہلکی ہلکی چسکیاں لیتے ہوئے وہ راہ گیروں پر اچٹتی نظر ڈال رہے تھے کہ اچانک ان کی نظر مدار پر پڑی۔ انھوں نے چونک کر بے اختیار اسے آواز دی۔ ارے! مدار او مدار! کہاں چل دیے بھئی! ادھر آؤ۔ آواز سن کر مدار خوش خوش لمبے ڈگ بھر کر قریب آیا اور خیریت پوچھی۔

مدار: سلام صاحب کیسے ہیں آپ۔

ابرار: اللہ کا شکر ہے اچھا ہوں۔ تم اپنی کہو بڑے دنوں بعد نظر آئے۔ ہمیں بھول گئے شاید۔ اور یہ کیا ٹھاٹ باٹ ہے سوٹ بوٹ بڑے عیش ہو رہے ہیں ایں؟ چائے پیو گے ادرک کا سواد ہے۔

مدار: (شرماتے ہوئے) عنایت ہے جناب کی مگر سندر ساتھ نہیں ہے۔ بنا اس کے مزہ نہیں آئے گا۔

ابرار: (پیالی آگے بڑھاتے ہوئے) ارے سندر کیا جانے ادرک کا سواد۔ اچھا چلو یہ چائے لو اور بسکٹ کے ساتھ نمکین بھی ضرور چکھنا اور ہاں سندر کو کہاں چھوڑ آئے وہ تو ہمیشہ تمہارے کندھے پر سوار رہا کرتا تھا۔

مدار: اس کے بھی مزے آگئے ہیں سرجی۔ منڈیر پر دم لٹکائے بیٹھا 'وی-آر-بی' (Virtual Reality Box) میں ٹم ٹگ کا 'گنگنم اسٹائل' کر رہا ہے۔

ابرار: اچھا! بڑی خوشی اور حیرت کی بات یہ ہے کہ ایسی چیزوں کے استعمال میں تم نے سندر کو کافی ٹرینڈ کر دیا۔ حالانکہ ایک وقت وہ بھی تھا جب تم غریبی کا رونا رو رہے تھے۔ اب کیا کوئی دفینہ ہاتھ آ گیا یہ ماجرا کیا ہے؟

مدار: ارے سر سب بتاؤں گا یوں سمجھئے کہ علی بابا کے غار کا دہانہ کھل گیا۔ مگر پہلے مجھے یہ بتائیے کہ یہ سیلفی چیز کیا

ہوتی ہے۔ اسی سے یہ سب کایاپلٹ ہوئی۔

ابو ادا: سیلفی کو تو خوشیوں کا گلدستہ سمجھو۔ اسے ہر پارٹی میں دوستوں کے ساتھ تنہائی میں کہیں بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

صداو: میں کچھ سمجھا نہیں سر۔

ابو ادا: میں سمجھاتا ہوں۔ موبائل فون ہوتا ہے نا جس کے روزن سے تصویر لیتے ہیں۔ اسے اپنے ہاتھ میں پکڑ کر اپنے بازو کو سیدھا تان دیں تاکہ موبائل آپ کے روبرو ایک ہاتھ کی دوری پر چلا جائے اور پھر فوکس کر کے کلک کر دیں۔ لیجیے آپ کی فوٹو موبائل کیمرہ میں قید ہوگئی۔ یہی سیلفی ہے۔

صداو: او ہو تو یہ بات ہے۔ سمندر بھی تو ایسا ہی کرتا ہے اور اگر زیادہ لوگ ہوں تو کیسے سیلفی لیں؟

ابو ادا: یہ بھی آسان ہے۔ اس کے لیے سیلفی اسٹک یعنی چھڑی استعمال ہوتی ہے۔ جس کے ایک سرے پر کیمرہ موبائل اور دوسرے پر لوگوں کا ہنگامہ ہوتا ہے جو فوٹو میں تاکتے رہتے ہیں۔

صداو: اچھا سر! اس کی شروعات کہاں سے ہوئی تھی؟

ابو ادا: ہر نئی اور عجیب چیز کی بنیاد تمھیں ہندوستان میں ہی ملے گی۔ جیسے کسی پانی کے چشمے کے سکوت میں تاروں کی جھلملاہٹ یا گھومتی ہوئی مچھلی کی آنکھ کا عکس پھر جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا، دوسروں نے ہندوستان سے گیان حاصل کیا چنانچہ 1839 میں فوٹو گرافی کے ہنر میں امریکہ میں پیش رفت ہوئی اور اس کے بعد امریکہ کے ساتھ 1900 سے لے کر 1970 تک دنیا کے مختلف ممالک میں بھی اس میں مزید بہتری کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ لفظ 'سیلفی' سب سے پہلے آسٹریلیا میں 2002 میں استعمال ہوا اور 2013 میں تو اسے "سال کا لفظ منتخب" (Word of the Year) قرار دیا گیا تھا۔

صداو: پھر تو اس کی شہرت میں چار چاند لگ گئے ہوں گے۔

ابو ادا: بالکل۔ بڑوں کے مقابلے میں نوعمر بچوں میں اس کا رواج عام ہے۔ کیا اسکول کیا کالج کیا گھر، بلکہ باتھ روم (حمام) میں تک اس کا استعمال ہوتا ہے۔ اگر وہاں بڑے اور روشن شیشے ہوں تو ان کو مرکز مان کر بھی واضح سیلفی لی جاسکتی ہے۔ الیکشن کے زمانے میں تو ووٹ دیتے وقت بھی سیلفی لی جاتی ہے۔ الیکشن جیتنے کے بعد جیتنے والے قائدین کی لاتعداد سیلفیز لی جاتی ہیں۔ چنانچہ 2012 میں امریکی صدر بارک اوباما اور 2014 میں بھارت کے وزیر اعظم نریندر مودی جی کی سیلفیز کی تعداد روزانہ لاکھوں سے اوپر ہے۔ سیلفی جانوروں میں بھی لی جاتی ہے چنانچہ ایک بن مانس نے افریقہ کے جنگل میں

ڈیجیٹل کیمرہ کا بٹن دبا کر رکھ دیا تھا۔ کچھ دن بعد دیکھا تو اس میں ہزار ہا سیلفیز کے ساتھ ساتھ ایک بندریا کا نیم تبسم پوز بھی نظر آیا۔ سیلفی کی ترسیل سوشل میڈیا سائٹ میں بھی کی جا سکتی ہے۔ جیسے فیس بک، ٹوئٹر، انسٹا گرام، ہائک، واٹس اپ، اسنیپ چیاٹ وغیرہ۔ زمین تو زمین سیلفی خلا نوردی کے دوران بھی لی جا سکتی ہے۔

چنانچہ زمین کی شکل مریخ سے اور مریخ کا واضح عکس زمین سے لیا جا چکا ہے۔ ناسا بھی تو کرتا ہے۔

صداو: مگر سر سیلفی لینے میں کہیں کوئی جوکھم تو نہیں ہوتا؟

ابواو: ہوتا کیوں نہیں، پرسوں ہی ایک لڑکا دریا کی طغیانی میں سیلفی لیتے ہوئے لڑھک کر غرق ہو گیا تھا۔ اگر آپ چھت پر سیلفی لے رہے ہیں تو سہارے کی خاطر کہیں کسی ہائی ٹینشن بجلی کے ننگے تار کو نہ پکڑ لیں، یا بے خیالی میں چھت سے باہر قدم نہ رکھ دیں۔ نتیجہ آپ کی سمجھ میں آ سکتا ہے۔ مزید یہ کہ مجرمانہ طبیعت کے لوگ بیہودہ تصاویر کے ذریعہ بلیک میل بھی کر سکتے ہیں۔ اس لیے سیلفی لیتے وقت ہمیشہ ماحول سے چوکنا رہیں۔ مگر تم مجھے ان باتوں میں الجھا کر اصل بات گول کر گئے۔

صداو: اصل بات؟ وہ کیا؟

ابواو: ارے بھول گئے! تم کہہ رہے تھے نا کہ علی بابا کے غار کا دہانہ کھل گیا، وہ کیا بات تھی۔

صداو: اوہ ہاں! اچھا یاد دلایا، ورنہ میں تو آپ کے لیکچر میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ بات یہ تھی کہ شہر کے چار چوک علاقے میں گول چبوترے پر میں حسب معمول سندر کے ساتھ شعبدہ بازی میں معروف تھا کہ ایک چار سالہ لڑکی نے سندر کی چالاکیوں اور قلا بازیوں سے خوش ہو کر اسے گود میں اٹھا لیا اور پچکارتے ہوئے اس کے ہاتھ میں اپنا بڑا سا موبائل تھما دیا۔ سندر نے بھی گال سے گال مس کرتے ہوئے اپنا ہاتھ تان کر سیلفی لے لی۔ لڑکی نے پرنٹ آؤٹ نکال کر اس کے ذیلی حاشیہ پر کچھ لکھ دیا.....(کچھ سوچتا ہے)

ابواو: (بے چین ہو کر) کیا لکھ دیا بھئی بتاؤ تو سہی۔

صداو: (غور کرتے ہوئے) بتا تو رہا ہوں آپ نے بیچ میں ٹوک دیا..... ہاں تو اس نے لکھا تھا "پہلوئے حور"۔

ابواو: (مسکرا کر) اچھا اردو تھا! اس کی مادری زبان رہی ہوگی۔

صداو: جی نہیں۔ وہ بتا رہی تھی کہ قومی اردو کونسل دہلی کی اردو کلاس میں ہی اس نے اردو سیکھی ہے اور فائنل امتحان میں دنیا بھر کے تمام تر امیدواروں میں ٹاپ کیا ہے۔

ابواو: (تعجب سے) اچھا پھر کیا ہوا؟

صداو: ہونا کیا تھا، اس نے وہ سیلفی نیشنل آرٹ گیلری کے مقابلہ میں روانہ کی جہاں پہلا انعام حاصل ہوا۔ اسی سے یہ ٹھاٹھ باٹ چل رہے ہیں۔ اب اس نے کسی انٹرنیشنل آرٹ مقابلہ میں وہی سیلفی روانہ کی ہے۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔

ابواو: اس نے اپنا حصہ نہیں لیا؟

صداو: اس نے منع کر دیا کہا کہ اسے ہالی وڈ، بالی وڈ اور اشتہاروں سے بہت آفرز آ رہے ہیں۔ ان میں سے بھی وہ ہمیں کچھ دے دیتی ہے۔

■

Mustafa Nadeem Khan Gauri
Zarina Villa, B-11, Green Valley, Rouza Bagh
Aurangabad- 431001 (MS)

پلاس

(بھارت کا ایک قدیم درخت)

بہار کا موسم شروع ہوتے ہی جنگل میں کہیں کہیں ایسا لگتا ہے جیسے آگ کی لال لال لپٹیں اٹھ رہی ہوں۔ دراصل یہ لپٹیں آگ کی نہیں بلکہ پلاس کے نارنگی رنگ لیے ہوئے لال پھولوں کی ہوتی ہے۔ پلاس کے درخت پر لگے ہوئے لال لال پھول آگ کی لپٹوں کا نظارہ پیش کرتے ہیں۔ اسی لیے انھیں فلیم آف دی فائر (Flame of the Fire) بھی کہا جاتا ہے۔

پلاس بھارت کا ایک قدیم درخت ہے۔ اس پر ایک ہی جگہ پر تین پتے بنے ہوتے ہیں اور اسی سے مشہور کہاوت 'ڈھاک کے تین پات' یا 'پلاس کے تین پتے' وجود میں آئی۔ انگریز شاعر ایڈون آرنلڈ نے اپنی کتاب 'دی لائف آف ایشیا' میں اس درخت کی بڑی تعریف کی۔ یہ درخت بنگال میں بہت پائے جاتے ہیں۔ نواب سراج الدولہ اور لارڈ کلائیو کے درمیان جس پلاسی نامی جگہ پر جنگ ہوئی تھی وہاں بھی پلاس کا جنگل تھا۔ یہ جگہ کولکاتا کے شمال میں لگ بھگ 150 کلومیٹر کی دوری پر ہے۔

پلاس 'لیگیومنوسی' خاندان سے تعلق رکھنے والا درخت ہے۔ پہلے اس کا نام بیوٹی اور سائنسی نام فرانڈوسا رکھا گیا۔ 'فرانڈوسا' کا مطلب ہوتا ہے 'پتوں سے ڈھکا ہوا'۔ پت جھڑ کے بعد جب پلاس پر پتے آتے ہیں تو یہ پوری طرح پتوں سے ڈھک جاتا ہے۔ شاید اسی لیے سائنسدانوں نے اسے یہ نام دیا ہو۔

یہ درخت بھارت میں اترپردیش، مدھیہ پردیش، بنگال، بہار، ہریانہ، پنجاب، مہاراشٹر، گجرات، کرناٹک میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔ بھارت کے علاوہ میانمار (برما) اور سری لنکا میں بھی زیادہ تعداد میں اس کے درخت نظر آتے ہیں۔

درمیانی قد کے اس درخت کی اونچائی 9 میٹر سے 12

میٹر تک ہوسکتی ہے۔ اس کا تنا بھی زیادہ موٹا نہیں ہوتا۔ اس کی چوڑائی 1.5 میٹر سے 1.8 میٹر تک ہوتی ہے۔ یہ ایک جنگلی درخت ہے جو میدانی جنگلوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ سڑکوں کے کناروں، کھیتوں کی منڈیروں اور تھوڑی بہت گیلی والی سادی سی جگہ پر بھی آسانی سے اُگ آتا ہے۔ اس درخت کے پتے سال میں ایک مرتبہ پورے گرجاتے ہیں اور یہ بنا پتوں والا درخت بن جاتا ہے۔ عام طور سے سردیوں میں اس کے پتے اُگنے شروع ہوتے ہیں۔ گرمیوں کے موسم میں پھولوں کے ختم ہوتے ہی نئے پتے نکلنے شروع ہوجاتے ہیں۔

پلاس کا درخت جب چھوٹی سی جھاڑی کے روپ میں ہوتا ہے تبھی اس میں بڑے بڑے پتے نکلنے شروع ہوجاتے ہیں۔ عام طور سے یہ دیکھا گیا ہے کہ اس درخت میں جہاں پھول ہوتے ہیں وہاں پتے نہیں نکلتے اور جہاں پتے ہوتے ہیں وہاں پھول نہیں لگتے۔

یہ درخت برگد، نیم اور پیپل کی طرح پھیلا ہوا ہوتا ہے۔

پلاس کے تین میں سے دو پتے لگ بھگ ایک جیسے ہوتے ہیں اور آزو بازو ہوتے ہیں۔ جبکہ تیسرا پتہ باقی دونوں پتوں سے بڑا ہوتا ہے۔ پتوں کی ڈنٹھل کافی موٹی اور مضبوط ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے زوردار ہوا چلنے پر بھی یہ ٹوٹتے نہیں۔

اس کے ہر پھول میں 5 پنکھڑیاں ہوتی ہے۔ اس کے پھول کے سرے کا حصہ طوطے کی چونچ کی طرح مڑا ہوا ہوتا ہے۔ پلاس کے پھول 5 سینٹی میٹر سے 9 سینٹی میٹر تک لمبے ہوتے ہیں۔

پلاس کے درخت پر جون جولائی میں پھلیاں لگتی ہیں۔ ان کا استعمال مختلف دیسی اور آیورویدک دواؤں میں کیا جاتا ہے۔

پھول کی طرح گوند دینے والا درخت ہے پلاس۔ اس کے گوند کو 'لاکھ' کہا جاتا ہے۔ اس درخت کا استعمال صرف دواؤں کے لیے ہی نہیں بلکہ اس کے مختلف حصوں کو مختلف کاموں میں استعمال کرتے ہیں۔ پلاس کی لکڑی سے چھوٹے چھوٹے تختے، کنویں کے پہیے وغیرہ تیار کیے جاتے ہیں۔

اس کا کوئلہ بہت جلدی آگ پکڑتا ہے۔ اس لیے اس کی لکڑی کے کوئلے کا استعمال 'گن پاؤڈر' (بندوق کے بارود) کے طور پر کیا جاتا ہے۔ پلاس کے پھول سے قدرتی زعفرانی رنگ تیار کیا جاتا ہے جو بہت سے لوگ ہولی میں استعمال کرتے ہیں کیونکہ بالکل نقصان دہ نہیں اور جلد اس سے خراب نہیں ہوتی۔

پلاس کے پتوں کو ہندو دھرم میں کھانے کی تھالی بنانے کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس کی چھال اور جڑوں کو رسیاں بنانے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور ساتھ ہی لاکھ کے کیڑے پالنے کے لیے بھی اس درخت کا استعمال کیا جاتا ہے۔

لیکن آج کل پلاس کی حالت بالکل اچھی نہیں۔

1975 کے بعد تقریباً تین دہائیوں میں تھالی بنانے والی فیکٹریاں کھل جانے سے پلاس کے جنگل جنگل صاف کردیے گئے۔

پلاس کے اس خاتمے سے ماحول کو لے کر ماہرین اور سائنسداں فکرمند ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ اب 'ٹشو کلچر' مصنوعی طریقے سے ہی پلاس کے نئے درخت لگائے جاسکتے ہیں اور اسی سمت میں 'ٹاٹا' اور 'جالو سندھان کیندر' ہریانہ اور 'قومی تجربہ گاہ' پونہ میں تحقیق کا کام شروع ہوچکا ہے۔ اگر اس کام میں کامیابی ملتی ہے تو ہمیں ایک بار پھر دہکتے انگاروں جیسے پلاس کے جنگل دیکھنے کو مل سکتے ہیں۔

■

محمد زاھد

نیوٹن
ایک عظیم سائنس داں

پیارے بچو! قدرت کے رازوں سے پردہ اٹھانے والے علم کا نام سائنس ہے۔ یہ کائنات یوں ہی نہیں بن گئی بلکہ اس کا ہر ذرہ اپنے اندر بہت ساری صلاحیت رکھتا ہے اور یہ سارا نظام ایک بندھے ہوئے اصول کے مطابق چلتا ہے۔ دنیا کے مختلف ملکوں کے سائنس داں ہر زمانے میں قدرت کے اصول اور قانون کو جاننے کی کوشش میں لگے رہے تاکہ ان کی روشنی میں انسانوں کی زندگی کو زیادہ بہتر بنا سکیں۔ آج آپ کو ایک ایسے ہی سائنس داں آئزاک نیوٹن (Isaac Newton) کے بارے میں ہم کچھ بتانا چاہتے ہیں۔

اردو کے لفظ اسحٰق (جو ایک مشہور پیغمبر کا نام ہے) کا انگریزی میں تلفظ آئزاک کے طور پر کیا جاتا ہے۔ نیوٹن کی پیدائش انگلینڈ میں 1642 میں ہوئی تھی۔ نیوٹن بچپن سے ہی بہت ذہین تھے۔ کائنات کے مشاہدہ سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے علم طبعیات (Physics) میں اپنی پوری عمر گزار دی اور اہم تجربات کیے۔ کائناتی کشش اور حرکت کے کلیے ان کی ایسی دریافت ہیں جو سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہوائی جہاز اور راکٹ کے بنانے میں ان تجربات نے اہم کردار نبھایا۔ حکومت نے انھیں 'سر' کا خطاب دے کر ان کی خدمات کا اعتراف کیا۔

اس عظیم سائنس داں کے اوائل جوانی کا ایک واقعہ کافی مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سیب کے باغ میں ایک پیڑ کے نیچے نیوٹن کتاب کے مطالعے میں مصروف تھے۔ اچانک شاخ سے

ایک سیب ٹوٹ کر زمین پر آرہا۔ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو سیب اٹھا کر کھانا شروع کردیتا لیکن نیوٹن نے سوچا کہ سیب شاخ سے الگ ہوکر آسمان کی طرف بھی تو جاسکتا تھا۔ یہ زمین کی طرف ہی کیوں آیا۔ یہ کون سا راز ہے؟ انھوں نے اس واقعہ کو بنیاد بنا کر تحقیق کی تو لگا کہ اوپر کی طرف پھینکی گئی گیند یا اڑنے والے پرندے بھی زمین کی طرف آتے ہیں۔ انھوں نے مزید تجربے کیے اور پتہ چلایا کہ زمین ہر چیز کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ جیسے مقناطیس (Magnet) لوہے کی بنی چیزوں کو اپنی جانب کھینچتا ہے۔ اس قوت کشش کی ایک حد ہے۔ زمین صرف ایک خاص اونچائی تک کی چیزوں کو اپنی طرف کھینچ سکتی ہے۔ اس کے اوپر یہ طاقت کمزور ہونے لگتی ہے۔ ایک مقام ایسا آتا ہے جب یہ کشش کام نہیں کرتی اور وہاں کی چیزیں لٹکتی رہتی ہیں۔ صرف زمین ہی نہیں بلکہ سورج، چاند، سیارے اور ستارے سبھوں کے اندر یہ قوت کشش پائی جاتی ہے۔

نیوٹن نے علم طبعیات کو حرکت کے تین مشہور کلیے دیے جو آج تک طلبا کو پڑھائے جاتے ہیں۔ پہلا کلیہ یہ ہے کہ ہر مادی شے چاہے وہ سکون کی حالت میں ہو یا حرکت میں، اپنی خصوصیت کو اس وقت تک برقرار رکھتی ہے جب تک کوئی بیرونی قوت اُسے اس حالت کو بدلنے پر مجبور نہ کردے۔ دوسرا کلیہ ہے کہ حرکت کی تبدیلی کی شرح اس بیرونی قوت کے براہ راست متناسب ہوتی ہے اور تیسرا سب سے مشہور کلیہ ہے کہ ہر عمل کا برابر اور مخالف ردعمل ہوتا ہے۔ بندوق سے نکلی ہوئی گولی اور راکٹ کی پرواز وغیرہ اسی اصول کے مطابق ہوتی ہے۔

تم نے دیکھا ہوگا کہ سڑک پر اگر کوئی شخص تیز چل رہا ہو اور اچانک اس کا پیر کسی پتھر یا اینٹ کے ٹکڑے پر پڑ جائے تو وہ آگے کی طرف جھک جاتا ہے یا گر جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ پتھر سے ٹکرانے کے بعد اس شخص کا پیر تو ساکن حالت میں آجاتا ہے لیکن کمر کا اوپری حصہ حرکت میں رہنے کے سبب اُسے جھکنے یا گرنے پر مجبور کردیتا ہے۔ اسی سبب سے چلتی ہوئی بس یا ٹرین سے مخالف سمت میں اترنا خطرناک ہوتا ہے۔ لوگ کپڑوں سے گرد و غبار صاف کرنے کے لیے اسے زور سے جھاڑتے ہیں۔ جھاڑنے پر کپڑے حرکت میں آتے ہیں جبکہ گرد کے ذرّات سکون کی حالت کو برقرار رکھنے کی کوشش میں کپڑوں سے الگ ہوجاتے ہیں۔

آئزک نیوٹن کا انتقال 1725 میں ہوا۔

■

Dr Mohd Zahid
Z-3/151/2/C, Dr A K Road
Kolkata - 700044 (W.B)

آؤ بچو پیڑ لگائیں

رنگ برنگے پھول کھلائیں
آؤ بچو پیڑ لگائیں
موسم کو گلزار بنائیں
آؤ بچو پیڑ لگائیں
دھرتی پر پانی برسائیں
آؤ بچو پیڑ لگائیں
رم جھم رم جھم برسے پانی
دھرتی کا آنچل ہو دھانی
ریگستان میں پھول کھلائیں
آؤ بچو پیڑ لگائیں
جب دیکھو بادل چھا جائے
کھیت سوکھنے کبھی نہ پائے
ہر موسم ہریالی لائیں
آؤ بچو پیڑ لگائیں
ایک پیڑ زندگی کے نام پر
ایک پیڑ بندگی کے نام پر
اچھلیں، کودیں، ناچیں، گائیں
آؤ بچو پیڑ لگائیں
پیڑوں سے سب کریں محبت
پیڑوں کی سب کریں حفاظت
دشمن ان کو کاٹ نہ پائیں
آؤ بچو پیڑ لگائیں
کمی آکسیجن کی نہ ہوگی
ہم سارے ہیں جس کے بھوگی
پیڑ صاف کرتے ہیں ہوائیں
آؤ بچو پیڑ لگائیں

Dr. Fariyad Azar
E 12/60A, Hauz Rani, Malviya Nagar
New Delhi - 110017

ایم رحمن

نیا سبق

ایک طالب علم اسکول میں فیل ہو گیا۔

دوسرے سال اس نے پھر امتحان دیا مگر وہ دوبارہ فیل ہو گیا۔ اس کے بعد جب اس کا تیسرے سال کا نتیجہ آیا اور اس نے دیکھا کہ وہ اب بھی فیل ہے۔ بہت مایوسی ہاتھ لگی تو اس کو سخت دھکا لگا۔ بیزار اتنا ہوا کہ گھر سے بھاگ گیا۔ گرچہ یہ قدم اس کا غلط تھا۔ جو اس نے اٹھایا تھا۔

چلتے چلتے وہ ایک گاؤں کے کنارے پہنچا۔

اس کو پیاس لگ رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ گاؤں کے لوگ جو پانی بھرنے کے لیے کنوئیں پر آتے ہیں۔ عام طور پر ان کے ساتھ دو عدد مٹی کے گھڑے ہوتے ہیں۔ ایک گھڑے کو وہ کنوئیں کے قریب ایک پتھر پر رکھ دیتے ہیں اور دوسرے گھڑے کو کنوئیں میں ڈال کر پانی نکالتے ہیں۔ جب اس نے دیکھا کہ جس پتھر پر گھڑا رکھا جاتا ہے وہ گھڑا رکھتے رکھتے گھس گیا ہے۔

"گھڑا مٹی کی چیز ہے" اس نے سوچا "مگر جب وہ بار بار بہت دنوں تک ایک جگہ رکھا گیا تو اس کے رگڑ سے پتھر گھس گیا۔ مسلسل کوشش کے ذریعہ مٹی نے پتھر کے اوپر فتح حاصل کر لی۔ مسلسل عمل نے کمزور کو طاقتور کے اوپر فتح یاب کر دیا۔ پھر اگر میں برابر محنت کروں تو کیا میں امتحان میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کیا کوشش کے اضافے سے میں اپنی کمی پر قابو نہیں پا سکتا۔"

یہ سوچ کر بھاگے ہوئے طالب علم کے قدم رک گئے۔ وہ لوٹ کر اپنے گھر واپس آ گیا اور دوبارہ تعلیم میں اپنی محنت شروع کر دی۔ اگلے سال وہ چوتھی بار ہائی اسکول کے امتحان میں بیٹھا۔ اس بار نتیجہ حیرت انگیز طور پر مختلف تھا۔ اس کے پرچے اتنے اچھے ہوئے کہ وہ اول درجہ میں پاس ہو گیا۔ تین بار ناکام ہونے والے نے چوتھی کوشش میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔

پتھر کا یہ سبق نوجوان کی زندگی کے لیے اتنا اہم ثابت ہوا کہ اس کی زندگی کا رخ بدل گیا۔ جو طالب علم ہائی اسکول میں مسلسل ناکام ہو کر بھاگا تھا وہ اس کے بعد مسلسل فرسٹ آنے لگا۔ یہاں تک کہ ایم اے میں اس نے ٹاپ کیا۔ اس کے بعد وہ ایک اسکالرشپ پر اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرون ملک میں گیا اور وہاں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

یہ انوکھا واقعہ نہیں جو صرف ایک گاؤں میں پیش آیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر جگہ ایسے پتھر موجود ہیں جو آدمی کو زندگی کا سبق دے رہے ہیں۔ جو ناکامیوں سے کامیاب بن کر نکلنے کا اشارہ دیتے ہیں۔ اگر آدمی کے اندر نصیحت لینے کا مزاج ہو تو وہ اپنے قریب ہی ایسا ایک پتھر پالے گا جو خاموش زبان میں اس کو وہی پیغام دے رہا ہو جو مذکورہ نوجوان کو اس پتھر سے ملا تھا۔

■

M. Rahman
160, Ghalib (APTT), Parwana Road
Pitampura, Delhi - 34

مشتاق اعظمی

نیم حکیم

کسی صحرائی علاقے سے ایک آدمی گزر رہا تھا۔ چلتے چلتے وہ ایک ایسے مقام پر پہنچا، جہاں کچھ لوگ جمع تھے۔ پاس ہی ایک اونٹ بیٹھا تھا۔ اونٹ کا گلا پھولا ہوا تھا اور وہ تکلیف سے بلبلا رہا تھا۔ جمع ہونے والے سوچ رہے تھے کہ اب اونٹ کی جان کیسے بچائی جائے۔ اتنے میں اونٹوں کا ایک چرواہا آیا۔ اس نے اونٹ کے مالک سے کہا: ”آپ گھبرا کیوں رہے ہیں۔ میں ابھی اونٹ کا علاج کرتا ہوں۔ شرط صرف اتنی ہے کہ آپ دو اینٹیں لا دیں۔“

اونٹ کا مالک تھوڑی دیر میں اینٹیں لے آیا۔ لوگ حیران تھے کہ اونٹ کا تو گلا پھولا ہوا ہے۔ اینٹ یا پتھر سے اس مرض میں کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟ لیکن اپنے اس تعجب کے باوجود لوگ چپ تھے۔ اس لیے کہ اونٹوں کے معاملے میں وہ اس چرواہے کی دانائی سے واقف تھے۔ چرواہے نے اونٹ کے گلے کو دیکھتے ہی معاملہ جان لیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اونٹ نے تربوز نگلنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ درمیان ہی میں پھنس گیا۔ اینٹیں آتے ہی اس نے بیٹھے ہوئے اونٹ کو لٹا دیا۔ ایک اینٹ اس نے پھولے ہوئے گلے کے نیچے رکھی۔ دوسری اینٹ اس نے اٹھائی اور اس انداز سے ہلکی ضرب لگائی کہ تربوز ٹوٹ جائے اور اونٹ کے گلے میں زخم بھی نہ آئے۔ چرواہا تجربے کار تھا۔ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ تربوز ٹوٹ گیا اور گلے سے اتر کر معدے میں پہنچ گیا۔ اونٹ کی جان بچ گئی۔

یہ سارا تماشا مسافر دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ یہ علاج بہت آسان ہے۔ وہ روزی کمانے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ اب گلے کے امراض کا اپنے آپ کو ماہر سمجھنے لگا۔ دل میں سوچنے لگا کہ اب میں کسی بھی بستی میں قیام کر کے روزی کما سکتا ہوں۔ انہی خیالات کو وہ دل میں لیے آگے بڑھتا رہا۔ شام کے وقت اسے ایک بستی نظر آئی۔ سوچا چل کر اس بستی میں رات گزار لوں۔ وہ بستی میں پہنچا تو کسی نے اس کو اپنا مہمان بنا لیا۔ سلام دعا کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اتنے میں ایک خادمہ آئی۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے مہمان کی نظر اس پر پڑ گئی۔ اس نے دیکھا کہ خادمہ کا گلا پھولا ہوا ہے۔ اسے اونٹ والا مرض اور علاج یاد آ گیا۔ میزبان سے کہا کہ آپ پسند کریں تو میں اس خادمہ کا چند منٹ میں علاج کر سکتا ہوں۔

میزبان نے بہت سمجھایا کہ یہ ایسا مرض نہیں، جو دو منٹ میں کسی چھو منتر سے ختم ہو جائے۔ برسوں علاج کیا گیا، مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ یہ تو گھینگا کا مرض ہے۔ زندگی کا ساتھی ہے۔ لیکن مہمان پر میزبان کی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اصرار کر کے دو اینٹیں منگوائیں اور پھر اس نیم حکیم نے خادمہ کو لٹا کر ایک اینٹ اس کے پھولے ہوئے گلے کے نیچے رکھی۔ ایک اینٹ ہاتھ میں اٹھائی اور پھولے ہوئے حصے پر پوری قوت سے ضرب لگائی۔ خادمہ ایک بار زور سے تڑپی اور ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔ اس کے بعد مہمان کی کیسی خاطر ہوئی ہو گی وہ آپ سمجھ سکتے ہیں۔

اس عبرت ناک واقعے سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ مکمل طور پر جانے بغیر کسی کام میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہیے۔ اسی لیے بزرگوں نے کہا ہے کہ نیم حکیم خطرۂ جان۔

■

Prof. Mushtaque Azmi
Azmi Mansion, 25, G.C. Mitra Road
Kishori Gali , Asansol-713301 (Kolkata)

محمد سراج عظیم

دوستی

وہ گول مٹول، گورا چٹا سا پانچ چھ سال کا چھوٹا بچہ تھا۔ اس کا گھر اوپر کی منزل پر تھا۔ اس کے کمرے کے آگے کافی بڑی سی بالکنی تھی۔ اس کے گھر کے سامنے ایک گھر تھا جس کی بڑی سی چھت پر طرح طرح کی چڑیاں، کبوتر، کوے اور گلہریاں گھومتی رہتی تھیں اور دانہ چگتی رہتیں۔ صبح کے وقت چڑیاں خوب چہچہاتیں جن کی آواز سے وہ اٹھ جاتا اور جا کر بالکنی پر کھڑا ہو جاتا اور چڑیوں کو دیکھتا رہتا۔ اس کو چڑیاں بہت اچھی لگتیں۔ وہ ان کو دیکھتا رہتا۔ ان کو بلاتا ”آؤ چوں چوں چڑیا آؤ میری چھت پر آؤ“ لیکن چڑیاں کچھ بھی نہیں سمجھتیں اور چھت پر دانہ چگتی رہتیں۔ جب دیر ہو جاتی تو اس کی ممی اس کو آواز دیتیں ”ارے بھیا سونو کیا کر رہے ہو منہ ہاتھ نہیں دھوؤ گے۔“

وہ جلدی جلدی اپنی ممی سے منہ ہاتھ دھلواتا۔ دانت برش سے صاف کرتا ناشتہ کرتا اور ممی سے چاول کے دانے لا کر چھت پر پھینکتا۔ چاول چھت پر تو نہ جاتے بلکہ گلی میں گر جاتے اور چڑیاں اڑ کر دور چلی جاتیں۔ سونو ماں سے پوچھتا ”ممی میں چڑیوں کو بلاتا ہوں لیکن وہ اپنی بالکنی میں آتی ہی نہیں۔“

”ہاں! بیٹا چڑیاں تم سے ڈرتی ہوں گی اس لیے نہیں آتی ہوں گی۔“ ماں جواب دیتی۔

”ارے ممی میں ان کو ڈراتا تھوڑی ہوں میں تو کچھ بھی نہیں کرتا ان کو دانہ بھی ڈالتا ہوں۔“ وہ جھنجھلا کر کہتا۔

”ہاں! بیٹا تم تو کچھ نہیں کرتے لیکن ساری چڑیاں آدمیوں سے ڈرتی ہیں“ ماں سمجھاتے ہوئے کہتیں۔ وہ منہ بسورتا اور رونے لگتا۔

”ارے بیٹا، اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ تم بالکنی سے کھڑے ہو کر چڑیوں کو دیکھتے تو ہو۔ ان کو اپنی بالکنی میں بلا کر کیا کرو گے“ اس کی ماں اس کو بہلاتے ہوئے کہتیں۔

اس میں اور اس کی ماں کے بیچ یہ باتیں روز ہوتیں۔ ایک دن وہ بالکنی میں کھڑا چڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔ تبھی ایک چھوٹی سی چڑیا گوریا بالکنی کی ریلنگ پر آ کر بیٹھ گئی۔ وہ چوں چوں کرتی ہوئی اپنی گردن ادھر ادھر گھما رہی تھی اس کو شاید دانہ کی تلاش تھی وہ شاید بھوکی تھی۔ اس نے گوریا کو جیسے ہی دیکھا تو اس نے وہیں سے کھڑے کھڑے اس سے پوچھا ”دانہ کھاؤ گی“ وہ جلدی سے بھاگ کر اپنی ماں کے پاس پہنچا ”ممی ممی جلدی سے چاول دیجیے اپنی بالکنی میں چڑیا آئی ہے اس کو کھلاؤں گا“ اس نے جلدی جلدی کہا۔

”اچھا بیٹا چڑیا آ گئی“ ماں نے خوش ہوتے ہوئے کہا

"اس کو دانہ دور سے خاموشی سے ڈالنا۔ نہیں تو چڑیا اڑ جائے گی" اس کی مٹھی میں گیہوں کے دانے دیتے ہوئے ماں نے اس کو سمجھایا۔

مٹھی میں دانے لیے ہوئے وہ جلدی سے بالکنی میں پہنچا۔ گوریا اِدھر اُدھر پھدک رہی تھی اور چوں چوں کر رہی تھی۔ بہت خاموشی سے سونو نے زمین پر دانے بکھیر دیے اور الگ کھڑا ہو گیا۔ گوریا نے جیسے ہی دانے دیکھے جلدی سے چوں چوں کرتی ہوئی پھدک کر دانوں کے پاس پہنچی اور چگنے لگی ایسا لگتا تھا وہ دانہ دیکھ کر بہت خوش ہوئی ہو۔ سونو بھی اس کو دیکھ کر بہت خوش تھا۔ گوریا جب دانہ چگ چکی تو چوں چوں کرتی ہوئی پھر سے اڑ گئی۔ جیسے سونو سے "ہائے ہائے" کہہ رہی ہو۔ وہ گوریا کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس نے ماں سے کہا "ممی چڑیا تو اڑ گئی۔"

"ہاں بیٹا اس کا پیٹ بھر گیا تو وہ اپنی ممی پاپا کے پاس چلی گئی۔ اب کل پھر آئے گی۔" ماں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا "چلو اب تم بھی کھانا کھا لو۔"

"کل آئے گی نا ممی" اس نے ماں سے پوچھا۔

"ہاں آئے گی لیکن اس کو پکڑنا مت نہیں تو گوریا نہیں آئے گی" ماں نے جواب دیا۔

"نہیں ممی، میں نہیں پکڑوں گا۔ ممی چڑیا کو گوریا کیوں کہتے ہیں" بہت بھولے پن سے اس نے پوچھا۔

"بیٹا یہ چڑیا گوریا کے نام سے ہی جانی جاتی ہے" ماں نے اس کی بات کا جواب دیا۔

دوسرے دن وہ چڑیوں کے چہچہانے سے اٹھ گیا اور جلدی سے بالکنی کی طرف بھاگا۔ تھوڑی دیر کے بعد گوریا آ گئی اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ دوڑ کر دانہ لایا اور گوریا کو ڈال دیا۔ یہ اس کا روز کا معمول بن گیا تھا۔ اب وہ بہت خوش تھا اس گوریا کی وجہ سے اس کی بالکنی میں بہت سی چڑیاں آنے لگیں۔ وہ بیٹھا ہوا ان کو دیکھتا رہتا۔ ان سے دلچسپ باتیں کرتا رہتا۔ چڑیوں کا بھی ڈر نکل گیا تھا وہ اس کے قریب آ جاتیں اور وہ جدھر جاتا اس کے پیچھے پیچھے جاتیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان میں آپس میں گہری دوستی ہو گئی ہو۔ اب وہ ادھر چھت پر بھی نہیں دیکھتا تھا اس چھت کی چڑیاں بھی اس کی بالکنی میں آنے لگی تھیں۔

گرمی کی ایک دوپہر گوریا اور بہت سی چڑیاں بالکنی میں اکٹھا ہو گئیں۔ گرمی بہت تھی۔ ساری چڑیاں اور گوریا اپنی چونچ کھولے چوں چوں چیں چیں کر کے شور مچا رہی تھیں۔ ان کو شاید پیاس لگ رہی تھی۔ اس لیے وہ بار بار چونچ کھول رہی تھیں اور چیخ رہی تھیں۔ ساری چڑیاں اس سے بہت مانوس تھیں۔ سب اس کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگیں۔ اس نے پوچھا گوریا پانی پیو گی تمھیں پیاس لگی ہے" وہ معصومیت سے چڑیوں کے بیچ بیٹھا پوچھ رہا تھا۔ گوریا آس پاس چوں چوں کر رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو "ہاں پیاس لگی ہے پانی چاہیے" وہ جلدی سے اٹھا اور اپنی ماں سے پیالہ مانگ کر اس میں پانی لا کر رکھ دیا۔ پانی دیکھتے ہی ساری چڑیاں اس پیالے کے آس پاس اکٹھا ہو گئیں اور پانی پینے لگیں۔ وہ بہت خوش ہوا۔ وہ وہیں بیٹھ گیا اور چڑیوں کو پانی پیتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اسی میں اس کی آنکھوں میں نیند کی جھپکی آنے لگی اور وہ وہیں زمین پر لیٹ گیا اور سو گیا۔

سونو کو بالکنی میں سوتے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی۔ ساری چڑیاں اس کے آس پاس پھدک رہی تھیں، اس کی ماں بھی اندر کام کر رہی تھیں۔ تبھی پتہ نہیں کہاں سے ایک سانپ نکل کر اس کی طرف بڑھنے لگا۔ سب سے پہلے گوریا نے

سانپ دیکھا چوں چوں کر کے اس نے زور سے شور مچانا شروع کیا تو ساری چڑیاں شور مچانے لگیں۔ کچھ بڑی چڑیاں اڑتی ہوئی سانپ کے اوپر پہنچ گئیں اور اس کے چونچیں مارنے لگیں۔ سانپ بہت تیزی سے ان پر جھپٹا لیکن چڑیاں دور اڑ گئیں۔ اب تو کچھ چڑیاں سانپ کے ہر طرف سے ٹھونگیں مارنے لگیں۔ سانپ اوپر کی طرف کھڑا ہو کر چڑیوں پر پھنکارتا اور ان کو پکڑنے کی کوشش کرتا لیکن چڑیاں کہاں اس کے ہاتھ لگتیں۔ کچھ چڑیاں گوریا کے ساتھ کمرے میں گھس کر زور زور سے شور مچانے لگیں۔ سونو کی ماں نے سوچا اچانک یہ چڑیاں کمرے میں گھس کر کیوں شور مچا رہی ہیں، دیکھوں تو کیا ہوا۔ ماں کو آتا ہوا دیکھ کر گوریا بالکنی میں اڑ گئی۔ بچے کی ماں بھی بالکنی کی طرف دوڑیں۔ ان کی نظر جیسے ہی سونو پر پڑی وہ سانپ کو دیکھ کر ایک دم چیخ پڑیں۔ انھوں نے پاس پڑا ہوا سل کا بٹہ اٹھا کر سانپ کے دے مارا۔ پھر ایک چیختی ہوئی وہ اپنے بیٹے کی جانب بھاگیں اور جلدی سے سونو کو اپنی گود میں اٹھا کر کمرے کی طرف بھاگیں۔ پتھر لگنے سے سانپ زخمی ہو کر تڑپ رہا تھا۔ ادھر چڑیوں نے بھی اس کو زخمی کر دیا تھا۔ سانپ تھوڑی دیر بعد مر گیا۔ ساری چڑیاں چوں چوں کرتی ہوئی کمرے میں داخل ہو گئی تھیں۔ جیسے پوچھ رہی ہوں سونو ٹھیک ہے۔ وہ سب اپنی خوشی کا اظہار کر رہی تھیں۔ سونو کی ماں نے اطمینان کا سانس لیا اور خوش ہو کر بولیں "ہاں تمھارا دوست ٹھیک ہے۔ تم نے اپنے دوست کی جان بچائی بہت بہت شکریہ۔ تمھاری دوستی بہت اچھی ہے۔"

■

Mohd Siraj Azim
A-47, Zakir Bagh
Okhla Road
New Delhi - 110025

جوابات

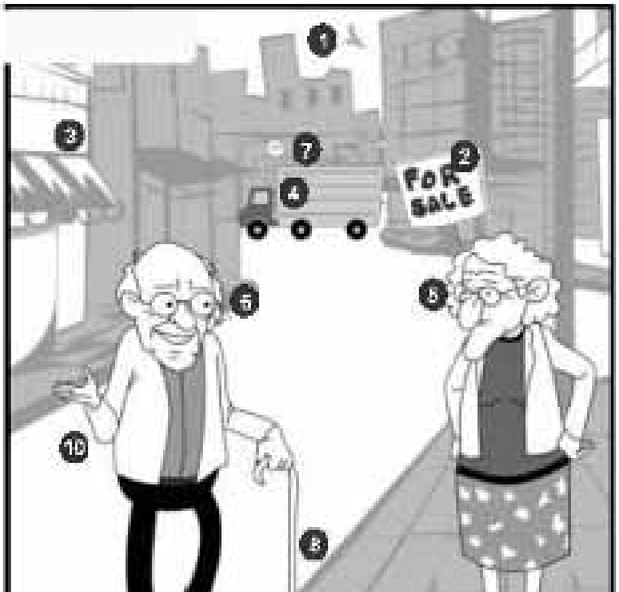

محمد منیر

جوتوں کا ریک

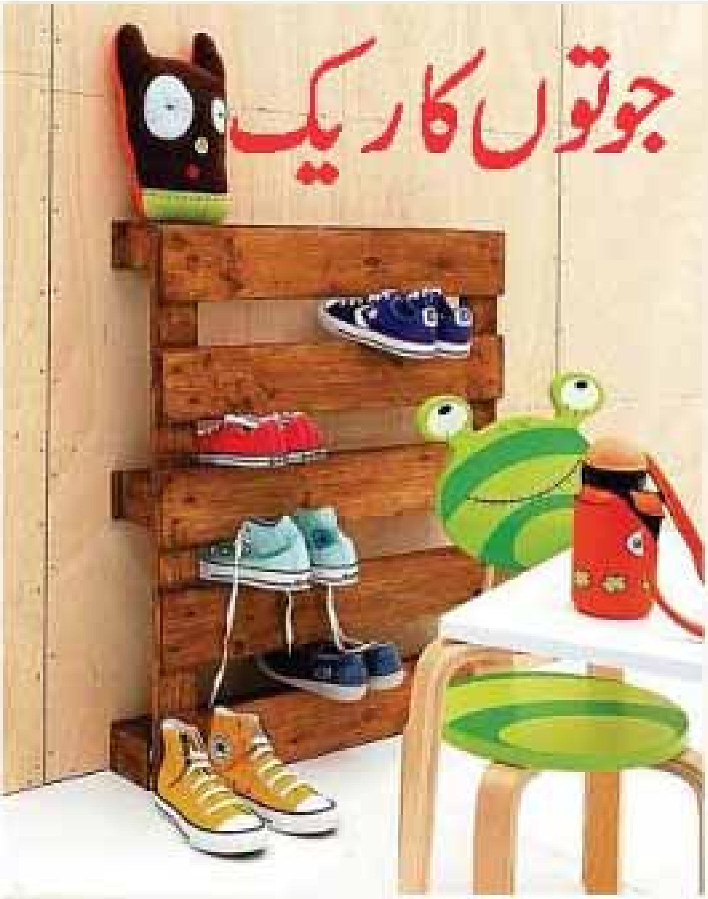

"میں ہر روز غور کر رہا ہوں کہ فراز شہباز فرحین' روبی تم اسکول سے واپس گھر آتے ہو تو اپنے جوتے صحیح ڈھنگ سے سیلف میں نہیں رکھتے ہو' چنانچہ مجھے اپنے جوتے تلاش کرنے پڑتے ہیں اور مجھے آفس جانے کے لیے دیر ہوتی ہے جبکہ میں ہر روز آفس سے گھر آتے ہی اپنی مقرر کی ہوئی جگہ پر اپنے جوتے رکھ دیتا ہوں۔ پھر بھی تم لوگ میرے جوتوں کے ساتھ بلکہ خود اپنے جوتوں سے غیروں جیسا رویہ اختیار کرتے ہو دیکھو بیٹا یہ ٹھیک نہیں ہے مجھے ہر روز تمہیں ہدایت کرنے پڑتے ہیں۔ بچو یہ کہنے والی کی بات نہیں ہے بلکہ تمہیں خود ہی سوچ سمجھ کر کرنی ہے۔ اگر میں ہر روز چھوٹی چھوٹی باتیں سمجھانے لگوں تو میرا وقت ضائع ہوگا جبکہ میرا اور آپ بچوں کا وقت ایک ہی ہے گھر سے نکلنے کا۔"

آفس سے گھر آتے ہی اپنے چار بچوں کو ایک صف میں کھڑا کر کے ابو نے سب کی تنبیہ کی' افسوس اس تنبیہ کا اثر صرف چار پانچ دن تک ہی محدود رہا پھر اس کے بعد بچوں کی روایت حسب معمول رہی۔ بچوں کے اس رویہ پر انھوں نے کچھ نہیں کہا بلکہ اپنے جوتوں و چپلیں کی حفاظت کے لیے ایک ریک نیا خرید لائے اور اپنے جوتے چپلیں سینڈلیں اس میں ترتیب سے رکھنے لگے اور بچوں کو دو ٹوک انداز میں کہہ دیا کہ "خبردار اگر کسی کے جوتے چپلیں اس میں نظر آئے تو اس کی خیر نہیں" ان کا انداز اس قدر غضب ناک تھا کہ کسی کی ہمت ہی نہیں ہوئی کہ اس میں جوتے یا چپلیں رکھیں۔

دن یوں ہی گزرتے گئے نہ ابو کو روز روز ہدایت کرنی پڑتی تھی اور نہ ہی انھیں اپنے آفس جانے میں دیر ہوتی تھی لیکن فراز اور اس کے بہن بھائی اپنی عادت سے مجبور تھے وہ اپنے جوتے چپلیں یوں ہی بے ترتیب رکھتے رہے۔

ہوا یوں کہ ایک دن ابو گھر رات دیر گئے آئے دیکھا کہ ان کے ریک سے متصل ایک نیا ریک رکھا ہوا ہے۔ صبح جب انھوں نے بچوں سے استفسار کیا تو فراز سر جھکاتے ہوئے کہنے لگا کہ "ابو کل اسکول میں ایسا ہوا کہ اسمبلی کے فوری بعد جب کلاس ٹیچر نے اپنی جماعت کے تمام بچوں کو اگلے ڈریس ٹائی اور جوتے چیک کیے تو انھیں یہ پتہ چلا کہ ہم نے جو موزے اور جوتے پہن رکھے تھے وہ علیحدہ علیحدہ رنگ و ڈیزائن کے تھے' جو اسکول جانے کی جلدی میں پہن لیا تھا اور اس کے

پاداش میں مجھے سخت اذیت برداشت کرنی پڑی"۔ ہاں ابو میرے ساتھ بھی ایسا ہوا" شہباز نے بھی برجستہ کہا اور اسکی نصیحت سے مجھے بھی دوچار ہونا پڑا۔

ابو کے چہرے سے مسکراہٹ جھلک رہی تھی لیکن وہ ہنسے نہیں بلکہ شہباز فراز روبی فرحین سے مخاطب ہو کر کہا "دیکھا بچو۔ تم نے میری ہدایت پر عمل نہیں کیا بلکہ اپنی من مانی کرتے رہے اور اس کا انجام کیا ہوا یہ تم جان چکے ہو اسی لیے بڑوں کی ہدایات پر عمل کرو گے تو ترقی کی راہ پر چلو گے اور منزل مقصود پاؤ گے۔" سب کے چہرے شرم وندامت سے جھکے ہوئے تھے اچانک روبی نے معصومیت سے پوچھا:

"ابو میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ آپ نے نیا ریک کیوں خریدا اور اپنے جوتے ہمارے جوتوں سے الگ کیوں رکھنے لگے آخر اسکا راز کیا تھا؟"

ابو صوفے پر بیٹھتے ہوئے بچوں کو بھی بیٹھ جانے کو کہا اور کہنے لگے "پیارے بچو تمہیں پہلے اس بات سے واقف کروانا چاہتا تھا لیکن یہ سوچ کر خاموش رہا کہ جو واقعہ میرے ساتھ ہوا ایک نہ ایک دن ضرور تمہارے ساتھ بھی ہوگا۔ درحقیقت واقعہ یہ ہوا کے مجھے ایک خاص میٹنگ میں شرکت کرنی تھی جلدی میں، میں نے جوتے پہنے اور میٹنگ میں شریک ہونے چلا گیا۔ میٹنگ کے نصف حصہ میں جب میری نظر اتفاق سے اپنے جوتوں پر تو دیکھا کہ جو جوتے میں نے پہن رکھے تھے دراصل وہ دو مختلف طرز ڈیزائن کے تھے جبکہ ان کا رنگ ایک ہی تھا۔ میں فوراً میٹنگ چھوڑ چھاڑ کر سیدھا گھر چلا آیا اور پہلی فرصت میں بازار سے ریک خرید لایا اور اپنے تمام جوتوں کو اس میں ترتیب سے رکھ دیا۔ دیکھو بچو جلد بازی سوائے نقصان و رسوائی کے اور کچھ نہیں دے سکتی البتہ ایک سبق ضرور دیتی کہ آئندہ ایسی غلطی ہرگز نہیں کرنا اسی لئے میں نے یہ اپنے آپ سے وعدہ کرلیا کہ آج کے بعد آفس سے آتے ہی گھر اپنے جوتے چپلیں موزے روزانہ صاف کر کے رکھا کروں گا تاکہ ایسی شرمندگی سے مجھے دوبارہ سامنا نہ ہو اور صرف ایک ہی ریک میں نے اس لئے خرید لایا کہ تم میں بھی یہ احساس پیدا ہو اور تم لوگ خود بھی حساس اور ذمہ دار بنو۔ مجھے خوشی ہے کہ میری دور اندیشی صحیح ثابت ہوئی ہے۔"

"ہاں ابو ہم سمجھ گئے آپ کی نصیحت کو آج کے بعد ہم لوگ پھر کبھی ایسی حرکت نہیں کریں گے" کیوں سب راضی ہیں نا؟ فرحین نے سب کو دیکھتے ہوئے کہا سب نے حامی بھری ہاں......ہاں...... ہاں، ہم سب تیار ہیں" اور اتنے میں امی جان نے ناشتہ کے لیے آواز دی اور سب ناشتہ کے لیے ڈرائنگ ہال میں چل دیے۔

■

Mohammad Muneer
H.No: 23-2-416/1, Moghal Pura
Hyderabad - 500002 (Telangana)

سراج فاروقی

آبِ حیات

چھیدی لال کی کنجوسی چہار دانگ مشہور تھی۔ دوست دشمن سبھی ان کی اس فطرت سے واقف تھے۔ وہ کسی کا پورا دانہ کھالیں گے مگر اپنا ایک کٹا ہوا دانہ عنایت نہیں کریں گے۔ چھیدی لال، یادو برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ اب اُن کا یہ نام کیوں پڑا یا کیوں رکھا گیا۔ ہم نہیں جانتے۔ ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے ان کو چھیدی یا چھیدیا ہی جانتے ہیں۔ اگر بہت پیار سے نام لیا تو چھیدی لال کہا۔ مگر اس قبیل کے لوگ انگلیوں پر گننے کے برابر تھے۔

چھیدی لال پیشے سے سائیکل کی مرمت کا کام کرتے تھے۔ ایک حساب سے انھیں یہ کام وراثت میں ملا تھا۔ پہلے اُن کے والد مرگنو لال یہ کام کرتے تھے۔ بس دونوں میں فرق اتنا تھا۔ وہ گاؤں میں یہ خدمت انجام دیتے تھے اور یہ شہر میں۔ چھیدی لال کی عمر 65-60 کے قریب ہوگی۔ رنگ کالا، درمیانی قد، گال پر ایک مسّا۔ سر اور داڑھی کے بال کھچڑی۔ داڑھی مہینوں مہینوں نہیں کرتے تھے۔ اگر کہیں دعوت وغیرہ میں گئے تو اُسترے کو ان کے گال چھونے کی اجازت تھی۔ ورنہ نہیں۔

اب بھی داڑھی تقریباً پندرہ روز کی اُگھوائی ہوئی تھی۔ ایک آنکھ موتیا بند کی وجہ سے خراب ہو گئی تھی۔ جس کی وجہ سے اُن کی شبیہ کچھ کی کچھ ہو گئی تھی۔ پھر بھی موٹی گلاس کی عینک پہنتے تھے۔ جس کی ایک ڈنڈی ٹوٹ گئی تھی۔ دھاگا باندھ کر کام چلا رہے تھے۔ گال پچکے ہوئے تھے۔ سامنے کے دو دانت چوہوں کے بل میں کب گئے پتہ ہی نہیں چلا۔ کبھی تیل نہ صابن۔ ایسے ہی نہاتے تھے۔ کہتے رگڑ گھس کر ہی نہانا چاہیے۔ کہیں اسی سے میل چھوٹتی ہے۔ ہاں کبھی بہت ضروری ہوا تو ذرا سا صابن کا استعمال کر لیتے تھے۔

آج دوپہر کا وقت تھا۔ جیٹھ کا سورج گرما رہا تھا۔ بھوک زوروں کی لگی تھی۔ بیوی ابھی تک نہیں آئی تھی۔ ہمیشہ روٹی لے کر دکان پر آتی تھی اور کھلا کر جاتی تھی۔ مگر آج جانے کیا ہوا آئی ہی نہیں۔ وہ اندر ہی اندر پیچ رہے تھے۔ کبھی دور کوئی عورت آتی دکھتی تو ماتھے پر ہاتھ کا چھجا بنا کر بغور دیکھتے۔ مگر جب پتا چلتا وہ غیر ہے تو کسمسا جاتے۔ صلواتیں اندر ہی اندر آتی دیتے کر سنا نہ جائے۔

دکان کیا تھی؟ گاڑھی ندی کی پل کے اختتام پر ٹھیلے پر ٹین کی کی ایک کیبن تھی۔ جس میں ان کا سارا ساز و سامان رہتا تھا۔ کبھی گراہک رہتے کبھی نہیں۔ اکثر وہ دو ڈھائی سو کا روبار کر لیتے تھے۔ آج ڈیڑھ سو کا کاروبار کر کے بیٹھے تھے۔ دوپہر ڈھلنے لگی تھی۔ دھوپ ایسی کہ نظر نہ ٹھہرتی تھی۔ ہاں گاڑھی ندی سے کوئی ہوا آتی تو تھوڑی سی ٹھنڈک ضرور مل جاتی تھی۔ مگر وہ اونٹ کے منھ میں زیرا کے برابر تھی۔

خیر وہ بھوک سے کلبلاتے ٹین کے ڈبے پر بیٹھے منھ کھولے اونگھ رہے تھے۔ مکھیاں آجا رہی تھیں۔ دفعتاً ان کی سماعت سے آواز ٹکرائی: ”انکل پنکچر بناؤ گے......؟“

چھیدی لال نے چہرے پر بیٹھی مکھی کو ہاتھ مار کر اڑایا اور آنکھیں کھول کر دیکھا۔ سامنے چودہ پندرہ سال کا پتلا دبلا لڑکا، گوری رنگت، سر کے بال چھوٹے چھوٹے، پاؤں میں کینوس کا سفید جوتا، بادامی رنگ کی فل پینٹ اور اسی سے ملتی جلتی رنگ کی چیک والی شرٹ اور گلے میں لال رنگ کی ٹائی باندھے کھڑا ہے۔

اسے تو بھوک زوروں کی لگی تھی۔ دل میں آیا کہہ دے۔ نہیں بنے گا۔ مگر دولت زیادہ کمانے کی چاہ نے زیر کر دیا۔ سوچا چلو پنکچر ہی بناتے ہیں۔ وقت نکل جائے گا۔ تب تک ہو سکتا ہے بیوی بھی آجائے۔ وقت ٹالنے یا بھوک کو ٹالنے کا یہ خوبصورت بہانا ملا۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام اور اس نے تھوڑے سے روکھے پن لیکن دلچسپی سے کہا: ”لاؤ......!“

لڑکے نے سائیکل کو اس کے آگے سلا دیا۔ وہ اپنے اوزار نے کر ٹائر کھولنے لگا۔ لڑکا اس کے پاس پڑے ٹین کے ڈبے پر بیٹھ کر اس کے سیاہ چہرے کو پڑھنے لگا۔

یکایک اس نے اپنے بیگ کی چین کھول کر خوبصورت پیکنگ کی خوشبودار بسکٹ نکال کر اس کے سامنے کیے: ”لیجیے انکل...کھائیے...!“

چھیدی لال ان بسکٹوں کو لالچ سے دیکھتا رہا۔ مگر لینے کی ہمت نہ جٹا پایا۔ اس کے منھ میں پانی بھر آیا۔ پانی کو اس نے قابو میں کیا۔ پھر بھی وہ بے قابو ہوا جاتا تھا۔

لڑکے نے التجائیہ لہجے میں کہا: ”لو انکل...“ اور خود ایک بسکٹ کو اپنا نوالہ بنا لیا۔

چھیدی لال نے منھ کے پانی کو دبا کر کہا: ”نہیں.... تم کھاؤ......“

”کھائیے...کھائیے.....!“ لڑکے نے محبت سے اصرار کیا: ”اس میں شرمانے والی کوئی بات نہیں ہے...کھائیے......“

جب التجا کا زور زیادہ بڑھا اور بھوک کے مارے چوہے دھما چوکڑی مچانے لگے تو اس نے جھجکتے ہوئے میلی انگلیوں سے ایک بسکٹ پکڑ لیا اور جب کھایا تو بہت لذیذ لگا۔ بھوک میں تو خراب چیز بھی اچھی ہو جاتی ہے۔ یہ تو پھر بھی اچھا ہی تھا۔ جب وہ کھا چکا تو لڑکے نے زندہ دلی سے اس کی طرف پیکٹ بڑھایا: ”کھائیے اور کھائیے......“

چھیدی لال اپنے آپ کو روک نہیں پایا اور بسکٹ نکال لیا۔

جب وہ بسکٹ کھا گیا تو لڑکے نے پیکٹ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا: ”یہ لیجیے انکل! آپ پورا کھا جائیے۔ اب میں نہیں کھاؤں گا۔ میری بھوک مٹ گئی ہے...“

”نہیں نہیں تم کھاؤ۔ تمھیں بھوک لگے گی...“

”لگے گی تو میرے پاس اور بھی ہیں.... آپ کھائیے......“

”آخرکار مجبوراً چھیدی لال نے وہ پیکٹ لے لیا۔ اسے آپ اس کا شوق سمجھیں یا مجبوری۔ چھیدی لال بڑے ہی چاؤ

سے بسکٹ کھاتا رہا اور لڑکا اپنے صاف شفاف تھرمس سے ٹھنڈا پانی غٹاغٹ پیتا رہا۔ جب چھیدی لال بسکٹ سے فراغت پا گیا تو لڑکے نے اپنا تھرمس اس کے آگے کر دیا، "لیجیے انکل.... پانی پیجیے...."

"نہیں نہیں یہ تمہارے لیے ہے...." وہ جلدی سے بول پڑا۔

"نہیں آپ پی جیے...." لڑکے نے محبت سے اصرار کیا۔

"آخرکار چھیدی لال نے جھجکتے ہوئے اس کا صاف شفاف تھرمس اپنے میلے کچیلے ہاتھوں سے پکڑ لیا اور اٹھا کر اس کا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پی کر کلیجہ تر کرنے لگا۔ جب پانی پی لیا تو اسے لگا یہ تو امرت ہے۔ آج تک اس نے نہ ایسا پانی پیا تھا اور نہ ہی بسکٹ کھایا تھا۔ بڑے لوگوں پر اسے رشک ہونے لگا۔ وہ سوچنے لگا، کیا وہ بھی اپنے بچوں کو ایسا پانی یا بسکٹ دے پائے گا۔ شاید ہاں! شاید نہیں! اب اس کی طبیعت میں گرانی نہ تھی جو کچھ لمحہ پہلے تھی۔ اب وہ ہشاش بشاش تھا۔ کسی کی حمایت پا کر آدمی موم ہو جاتا ہے۔ اب ایسا ہی کچھ حال چھیدی لال کا بھی تھا۔ وہ لڑکے کے اطوار و اخلاق سے بہت متاثر ہوا۔ وہ لڑکا اسے فرشتہ اور محسن نظر آیا۔ وہ اس کا مقروض و احسان مند۔

پنکچر بناتے ہوئے چھیدی لال نے مسرت آمیز لہجے میں کہا، "تمھیں یہ سب کس نے سکھایا...؟"

"لڑکے نے خوشدلی سے کہا، "ہمارے ابو نے....."

"تمہارے ابو بہت اچھے انسان ہیں...."

"پھر...!"

"کسی دن اپنے ابو سے ملوایئے...!"

"ہاں! کیوں نہیں....؟"

جب سائیکل تیار ہوئی تو چھیدی لال نے اس کی سائیکل کھڑی کی اور اس کی سیٹ وغیرہ پر کپڑا مارنے لگا۔

لڑکے نے کھڑے ہو کر انکساری سے کہا، "کتنا ہوا انکل....؟"

چھیدی لال ایک لمحہ تک اس لڑکے کے معصوم چہرے کو دیکھتا رہا۔ پھر مسکراتے ہوئے کہا، "تم سے پیسہ لینا بہت بڑی بے ایمانی ہوگی...."

"کیوں...؟" لڑکا سراپا سوال بن گیا۔

"ارے تم نے اتنا اچھا بسکٹ کھلایا اور ٹھنڈا ٹھنڈا امرت رس جیسا پانی پلایا۔ اس سے بڑھ کر اور روپیہ کیا ہوگا؟ معلوم، تمہاری آمد سے پہلے بھوک سے کلبلا رہا تھا۔ تم نے بسکٹ کھلایا تو میری آنتا شانت ہو گئی۔ میرا پیٹ شانت ہو گیا۔ میں ہرگز ہرگز کوئی روپیہ نہیں لے سکتا ہوں...."

لڑکا حیرت سے اسے تکتا رہا اور بولا، "تو اس میں کون سی بڑی بات ہے انکل...."

"ہے ناں..." چھیدی لال اسے احسان مند نظروں سے دیکھنے لگا۔

لڑکا بہت بضد ہوا مگر چھیدی لال نے کوئی رقم نہیں لی۔ آخر وہ مجبوراً وہاں سے چلا بنا۔ جب وہ سڑک پر اُچک اُچک کر پیڈل مارتے ہوئے ہوا کا سینہ چیرتے چلا جا رہا تھا تو چھیدی لال کو ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی فرشتہ آبِ حیات لے کر آیا اور اسے پلا کر چلا گیا ہے۔

■

Siraj Farooqui
703, Wadghar, Near College
Phata, Panvel - 410206
Distt.: Raigad (Maharashtra)

بچوں کا کتب خانہ

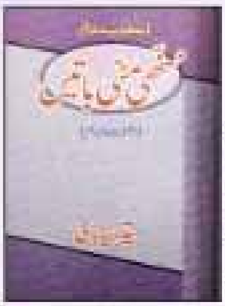

ننھی منی باتیں (ہشتم تا دوازدہم)
اطفال حیدر بیابانی
تین سو ستر (370) عنوانات

پیارے بچو! آپ اس صفحے پر جس کتاب کی تصویر دیکھ رہے ہیں اس کا نام انتخاب دوم ننھی منی باتیں (ہشتم تا دوازدہم) ہے۔ اس کتاب کو معروف ادیب اطفال حیدر بیابانی نے لکھا ہے۔ آپ نے قلم سے اپنا رشتہ بچپن ہی میں جوڑ لیا تھا اور کتابوں سے دوستی کر لی تھی۔ جس عمر میں بچے کتابوں سے جی چراتے ہیں اس زمانے میں بچوں کے مشہور رسائل جیسے بانو، شمع، سشما، شاعر، بیسوی صدی اور صبح امید وغیرہ میں ان کی نظمیں شائع ہوتی تھیں۔ آپ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ جب کوئی انسان اچھا کام کرتا ہے تو اسے انعام بھی ملتا ہے ٹھیک ایسے ہی آپ کے ہردلعزیز شاعر حیدر بیابانی نے پچھلے تیس برسوں سے پینتیس (۳۵) سے زیادہ کتابیں بچوں کے لیے لکھی ہیں جو بے حد مقبول ہوئیں۔ تقریباً تمام کتابوں کے دو دو تین تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ کونسل کی شائع کردہ کتاب "بے زبانوں کی دنیا" کے چار ایڈیشن آ چکے ہیں۔ حیدر بیابانی نے اتنے برسوں میں بچوں کے لیے جو شاعری کی اسے دیکھتے ہوئے ملک کی مختلف اردو اکادمیوں نے انھیں بہت سارے انعامات سے نوازا۔ یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ اس مجموعے میں موجود نظموں کو ملک کی الگ الگ ریاستوں کے نصاب میں شامل کیا جا رہا ہے۔ بچو! ایک دلچسپ بات بتاتا چلوں۔ جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں آج کا دور موبائل (Mobile) انٹرنیٹ (Internet) اور آئی پیڈ (I-pad) کا ہے۔ لہٰذا آپ حیدر بیابانی کی خوبصورت نظمیں انٹرنیٹ پر بھی پڑھ سکتے ہیں۔

کتاب میں تین سو ستر (370) عنوانات پر اتنی دلکش نظمیں ہیں کہ بس پڑھتے چلے جایئے مثلاً اشیاء، جاندار، مناظر قدرت، شجر، موسم، رشتے ناطے، پرندے، خوشیاں غم اور پھل پھول وغیرہ۔ پہلے پہل جب حیدر بیابانی نے کتاب مجھے دی اور گھر جا کر میں نے اس کا مطالعہ شروع کیا تو میں اس میں کھو گیا اور وقت کا پتہ ہی نہیں چلا۔ اس مجموعے میں موجود تمام نظمیں انتہائی آسان ہیں جو دل کو چھو لیتی ہیں۔ ایک نظم ختم ہوتی ہے تو دوسری پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ خوب مزے مزے کے الفاظ زبان سے ادا ہوتے ہیں جیسے کوئی کھٹی میٹھی گولیاں منہ میں گھول رہا ہے۔ یہ بارش کا موسم ہے اور مینڈک ہر جگہ ٹراتے پھرتے ہیں۔ اس لیے شاعر نے نظم 'مینڈک' میں اسے دیکھ کر یہ کہا

مینڈک پھدک رہا ہے   ہم سب کو تک رہا ہے
ندیوں کا شاہ زادہ   تیراک ہے بلا کا

نظم 'بات' میں ایک نصیحت چھپی ہوئی ہے۔

بات بے تول مت کبھی بولو
پہلے تولو زبان پھر کھولو

جب آپ اس کتاب کو پڑھیں گے مجھے یقین ہے کہ پہلی ہی دفعہ میں بہت سارے اشعار یاد ہو جائیں گے کیونکہ ان نظموں میں اردو اور انگریزی کے اتنے آسان اور عام فہم لفظوں کا استعمال کیا گیا ہے کہ انھیں ہم بغیر کسی مشکل کے یاد رکھ سکتے ہیں جیسے آسمان، مچھلی، اسکول، تیر کمان، بینگن، گڑ، شکر، مسجد اور عید گاہ وغیرہ۔ اب ذرا چند نظموں کے عنوانات بھی سن لیجیے: پولیس والا، معصوم فرشتے، اچھل پور، ناگ پور، دوستی، سلام کریں، انڈے اور ڈنڈے۔ مجھے تقریباً تمام نظمیں پسند ہیں خاص طور سے نظم 'پرندے' بہت پسند آئی۔

پرندے چار سو اڑتے پرندے — ادھر آتے ادھر جاتے پرندے
انھیں آتا نہیں رونا رلانا — ہے فطرت میں ہمیشہ چہچہانا

اس کتاب میں صفحات کی تعداد 584 ہیں اب آپ خود اندازہ لگایئے اس میں کیا کچھ موجود نہیں۔

اس کتاب کی پرنٹنگ رحمانی پبلی کیشن مالیگاؤں سے ہوئی ہے۔ جو بچے مالیگاؤں میں رہتے ہیں وہ اس کتاب کو وہاں سے بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ بچو! اس کتاب میں ایک بہت اچھی بات یہ بھی ہے کہ آپ کی دلچسپی قائم رکھنے کے لیے بہت ساری نظموں کے پیچھے دلآویز تصاویر بھی موجود ہیں کہیں کوئی روبوٹ دکھائی دیتا ہے تو کہیں بھالو میاں دو پیروں پر کھڑے ہیں اور کسی صفحہ پر خوبصورت گھڑی جگمگا رہی ہے مجھے سب سے اچھی تصویر اس سپیرے کی دکھائی دی جس کے بین بجاتے ہی ایک کالا سانپ ٹوکری سے ناچتا ہوا اپنا سر نکالتا ہے۔

ابھی ابھی عید گزری ہے بچوں نے اس عید میں خوب خوشیاں منائی ہیں سوئیاں اور شیر خرمے کھائے ہیں اور خوب عیدی بھی حاصل کی ہے لہٰذا عید کے اس موقع پر 'ہلال عید' بڑی اچھی نظم ہے یہ اشعار

سج اٹھیں گے پھر سے تن پر لباس
ہاتھ آئیں شیر خرمے کے گلاس
لب پہ ہو میٹھی سویوں کی مٹھاس
تیرا آنا ہر کسی کو بھا گیا
اے ہلال عید جو تو آ گیا

اسی طرح صفحہ نمبر 321 پر 'عید اور مہنگائی' نظم خاص طور سے ہمارا دھیان کھینچتی ہے کیونکہ مہنگائی کے اس دور میں غریب خاندانوں کی عید بڑی بے رنگ ہوتی ہے مہنگائی کی وجہ سے وہ مہنگے کپڑے، میوے اور دوسری ضروری چیزیں خرید نہیں سکتے ہیں ان اشعار سے ان کی حالت ظاہر ہوتی ہے۔

کیسے ہم اب عید منائیں — مہنگائی ہے چار دشائیں
جینس نئی شرٹ پرانی — گھر گھر کی ہے یہی کہانی
سب کچھ نوٹوں میں تلتا ہے — مفلس من ہی من گھلتا ہے

مہنگائی ہر راہ گذر ہے
مہنگے میوے دودھ شکر ہے
کیسے ہم اب عید منائیں

حیدر صاحب نے اردو پڑھنے والے بچوں کو 'ننھی منی باتیں' کی شکل میں خوبصورت تحفہ دیا ہے۔

■

Azhar Abrar
Dept of Urdu, S.K Porwal College of Arts
Science & Commerce, Kamptee,
Distt.: Nagpur - 441001 (Maharashtra)

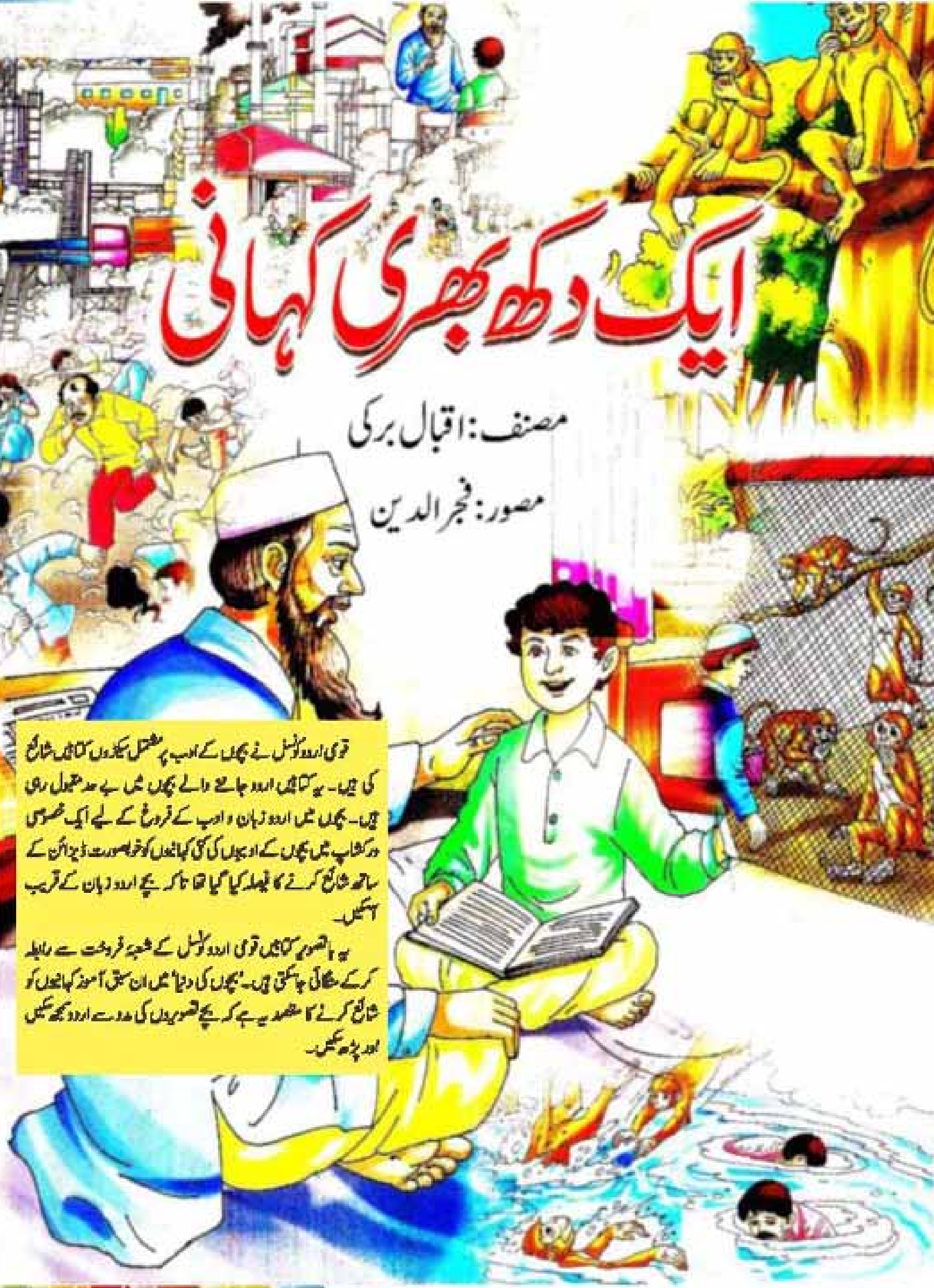

ایک دکھ بھری کہانی

مصنف: اقبال برکی

مصور: فجر الدین

قومی اردو کونسل نے بچوں کے ادب پر مشتمل سیکڑوں کتابیں شائع کی ہیں۔ یہ کتابیں اردو جاننے والے بچوں میں بے حد مقبول رہی ہیں۔ بچوں میں اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے ایک خصوصی ورکشاپ میں بچوں کے ادیبوں کی کئی کہانیوں کو خوبصورت ڈیزائن کے ساتھ شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا تاکہ بچے اردو زبان کے قریب ہوسکیں۔

یہ باتصویر کتابیں قومی اردو کونسل کے شعبۂ فروخت سے رابطہ کرکے منگائی جاسکتی ہیں۔ بچوں کی دنیا میں ان سبق آموز کہانیوں کو شائع کرنے کا مقصد یہ ہے کہ بچے تصویروں کی مدد سے اردو سمجھ سکیں اور پڑھ سکیں۔

"نہیں......... میں نہیں جانتا!" کہنے سے پہلے ہی اس نے نفی میں زور زور سے اپنا سر ہلانا شروع کر دیا تھا۔

"تو سنو! سنو بیٹا!! اس لیے کہ بندر ایک ایسا جانور ہے جو کبھی کوئی ایسی چیز نہیں کھاتا جس پر اُسے نقصان کا خوف ہو۔

وہ اپنی غذا اور اپنے کھانے پینے کے معاملے میں بہت محتاط ہوتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بندر کھانے سے پہلے کسی بھی چیز کو بار بار سونگھتے ہیں۔ اُسے خوب اُلٹ پلٹ کر دیکھتے ہیں۔ اچھی طرح اطمینان کر لیتے ہیں تب کہیں جا کر منہ لگاتے ہیں۔"

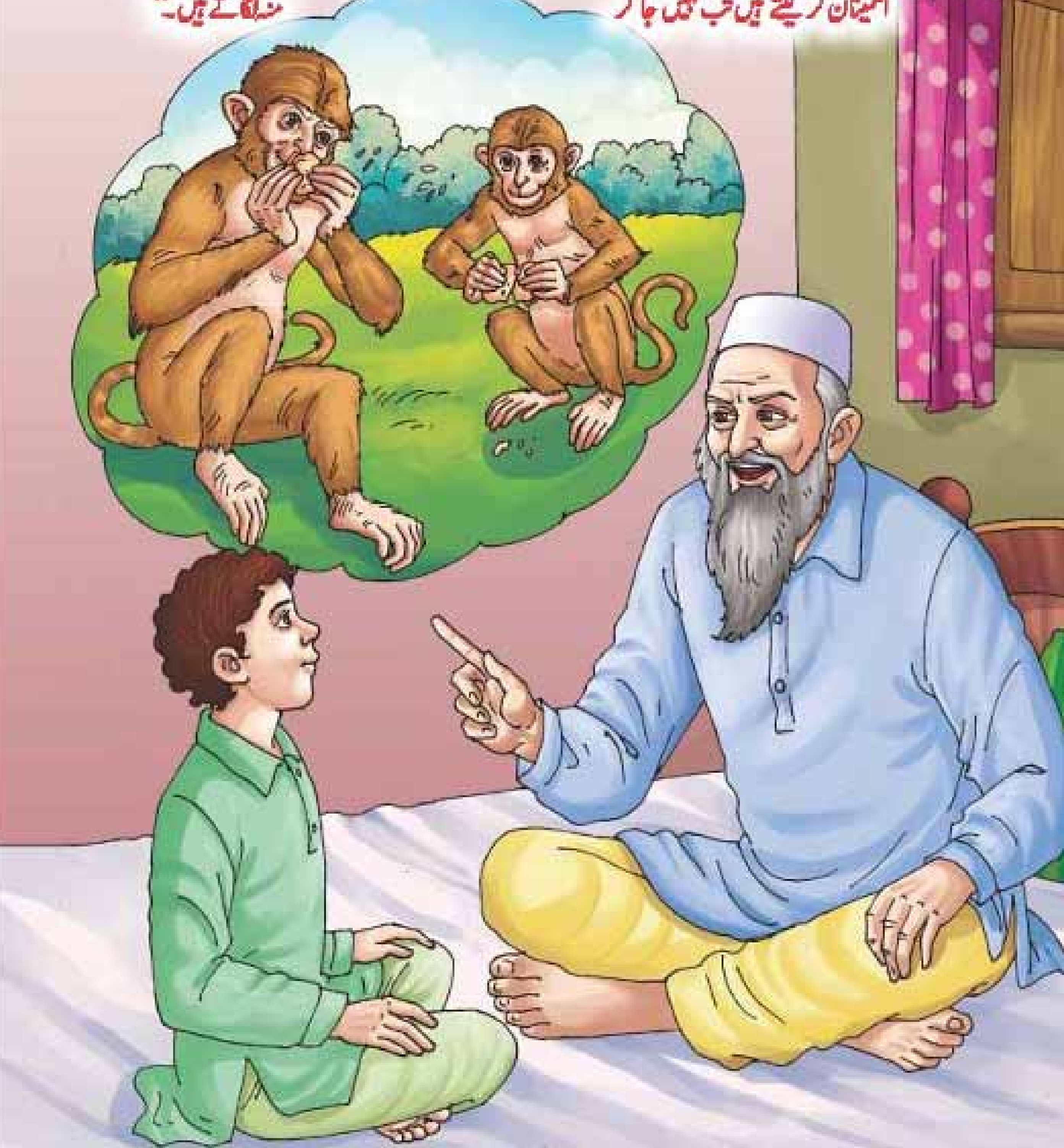

"اُف............ہاں............ہاں............بالکل............اورنگ آباد کے چڑیا گھر کے بندر کے پنجرے میں جب رؤف بھیا نے مونگ پھلیاں پھینکی تھیں تو بندر انھیں اٹھا کر بار بار سونگھتے تھے۔ کئی کئی بار سونگھنے کے بعد انھوں نے مونگ پھلیاں کھائی تھیں۔"

اس نے جلدی سے اپنا ایک مشاہدہ بیان کر دیا۔

”ہاں .... ہاں ٹھیک .... بالکل .... بالکل ٹھیک .... تو بالکل اسی طرح وہاں بھوپال میں سیل بنانے والی اس فیکٹری کے آس پاس کی بستی اور اس سے لگی پہاڑیوں پر بہت سے بندر بھی رہتے تھے۔ جیسے ہی وہ گیس ان کی ناک اور نتھنوں سے حلق تک پہنچی تو انہیں بھی اپنے حلق میں جلن اور گھٹن کا احساس ہوا۔

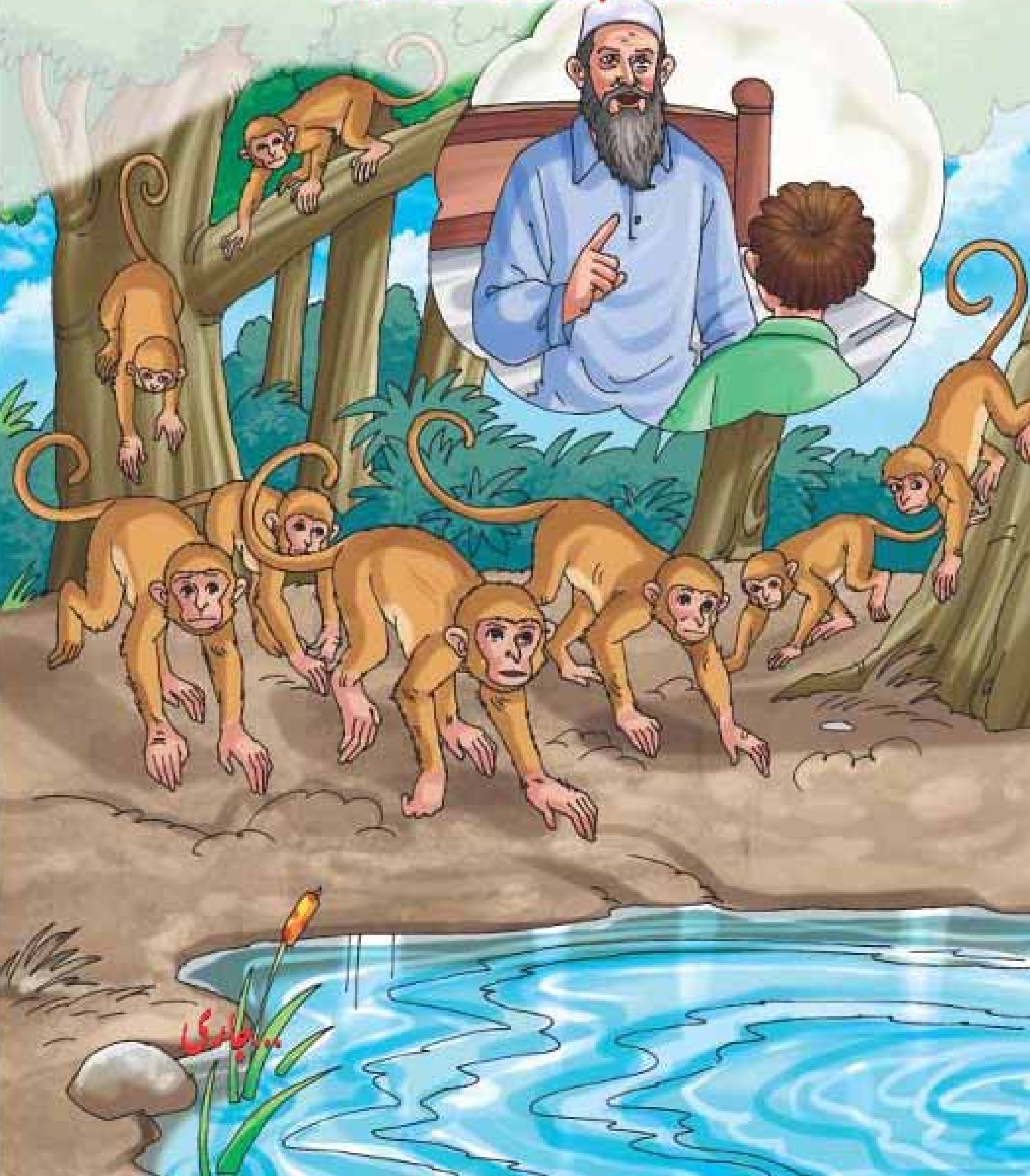

...جاری ہے

مصنفہ: جولز ورنی
مترجم: شکیل صدیقی

چوتھی قسط

زمین کی تہہ میں

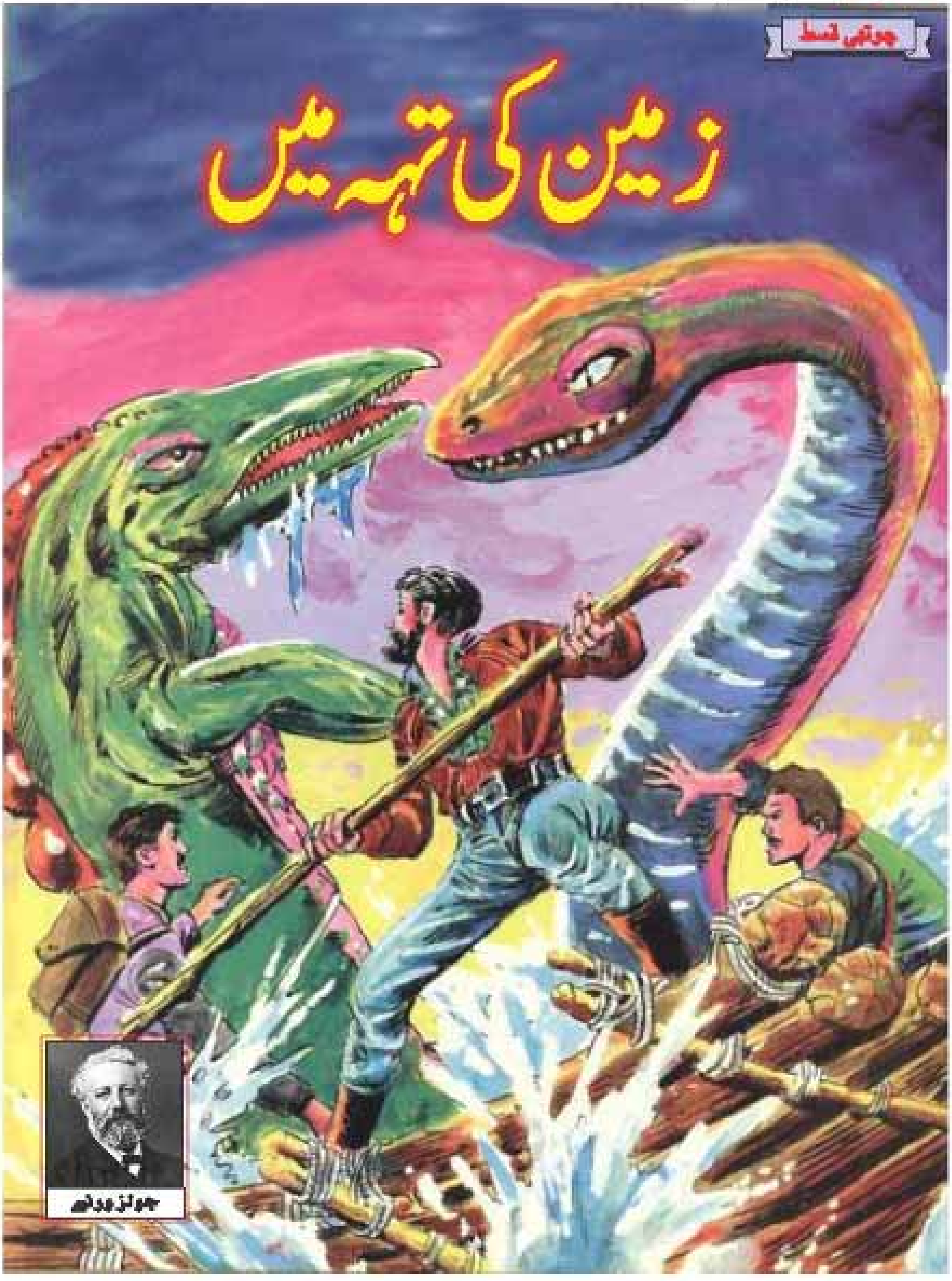

ہماری کوشش ہوتی ہے کہ آپ کو نئے نئے جہانوں کی سیر کرائیں اور ثقافتی، تاریخی و تہذیبی معلومات کے ساتھ ساتھ جغرافیائی، ارضیاتی اور سائنسی معلومات بھی فراہم کریں۔ یہ ناول پہلے فرانسیسی زبان میں 1864 میں لکھا گیا تھا۔ اس ناول کا ترجمہ اردو سمیت دنیا کی اہم زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اس ناول کے مصنف جولز ورنے ہیں جو عالمی ادب میں فادر آف سائنس فکشن کے طور پر مقبول ہیں۔ ان کے ایک ناول Around the World in Eighty Days کو بہت زیادہ شہرت ملی تھی۔ جس کو آپ نے بچوں کی دنیا میں قسط وار پڑھا بھی ہے۔ جولز ورنے کے ناول بچوں کے ساتھ بڑوں میں بھی بہت مقبول رہے ہیں۔ انھیں نئے نئے جہانوں کی سیر کرنے اور کرانے میں ملکہ حاصل تھا۔ ان کے ناولوں پر کئی فلمیں اور ٹیلی سیریل بھی بن چکے ہیں۔ 'زمین کی تہہ میں' ایک ایسا ناول ہے جس میں زمین کے ہزاروں فٹ نیچے کی دنیا کو دکھایا گیا ہے۔ یہ پروفیسر لائڈین بروک کی کہانی ہے جو ایک پراسرار تحریر کے بعد زمین کی تہہ کے ایک سفر پر نکلتا ہے جس میں اُسے ڈھیر ساری مشکلات پیش آتی ہیں۔ عجیب و غریب جانداروں اور اشیا سے اُس کا سامنا ہوتا ہے۔ وہ کس طرح زمین کی تہہ تک پہنچتا ہے اور واپس اس دنیا پر آتا ہے یہی اس ناول کا ماحصل ہے۔ اس میں آپ کو سائنس کی اہم معلومات کے ساتھ ساتھ زمین کے اندر کی عجیب و غریب جانکاریاں بھی ملیں گی۔

اب تک آپ نے پڑھا کہ پروفیسر لائڈین بروک معدنیات و ارضیات کے ماہر تھے۔ وہ بہت قابل شخص تھے اور علاقے میں ان کی کافی عزت تھی، انھیں پرانی کتابوں سے بھی دلچسپی تھی۔ ایک دن انھیں سات سو سال پرانی کتاب ہاتھ لگی جو آئس لینڈ کی زبان میں تھی۔ پروفیسر بروک اپنے بھتیجے کے ساتھ رہتے تھے۔ چچا بھتیجے نے اس کتاب کی تحریر سمجھنے کی کوشش کی۔ بہت مشکل سے بس وہ کچھ الفاظ ہی سمجھ پائے۔ پروفیسر لائیڈن بروک کہیں چلے جاتے ہیں اور ادھر بھتیجہ اس تحریر کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ وہ نہیں چاہتے ہوئے بھی پروفیسر کو بتا دیتا ہے کیونکہ اس میں ایک خطرناک سفر پر جانے کی بات تھی۔ تحریر کو پڑھنے اور سمجھنے کے بعد پروفیسر نے سفر پر جانے کی ٹھان لی۔ بھتیجہ (البرٹ) نہیں چاہتے ہوئے بھی تیار ہو گیا۔ آخرکار دو دن بعد لائیڈن بروک اور البرٹ اس خطرناک سفر پر نکل گئے۔ سفر کے لیے انھیں کوپن ہیگن پہنچنا تھا اور وہاں سے آئس لینڈ۔ آئس لینڈ پہنچنے کے بعد ایک رات آرام کیا اور پھر دوسرے دن صبح وہاں کے مشہور آتش فشاں سنیفل کا سفر شروع کیا۔ یعنی تقریباً پانچ ہزار فٹ بلند پہاڑ تھا۔ کئی طوفان اور دیگر پریشانیوں کا سامنا کرتے ہوئے چچا بھتیجے سنیفل کی چوٹی پر پہنچتے ہیں۔ چوٹی سے اب آتش فشاں کے اندر اترنے کا خطرناک سفر شروع ہوا۔ دونوں لوگ سنبھل سنبھل کر زمین کی تہہ میں اترنے لگے۔ اب آگے

ہمارا گائیڈ ہانس

دوسری صبح جب میں بیدار ہوا تو میں نے دوسرے کمرے سے چچا جان کی آواز آتی سنی جو کسی سے اونچے لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔ میں بستر سے اٹھا اور ان کے پاس چلا گیا۔ وہ ڈینش زبان میں ایک دراز قامت، مضبوط جسم والے آدمی سے باتیں کر رہے تھے جس کے بال سرخ تھے اور نیلی آنکھوں سے ذہانت جھلک رہی تھی۔ وہ ہاتھ باندھے کھڑا تھا اور چچا جان کی

پرجوش باتوں سے قطعی متاثر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جب وہ 'نہیں' کہنا چاہتا تو اپنا سر دائیں بائیں ہلا دیتا اور جب 'ہاں' کہنا چاہتا تو اپنا سر اتنی آہستگی سے آگے جھکا دیتا کہ اس کے لمبے بالوں میں حرکت نہ ہوتی۔

مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ آدمی شکاری ہوسکتا ہے، مگر مسٹر ڈکسن نے وضاحت کی کہ وہ ایک خاص قسم کی بطخ کا شکار کرتا ہے اور وہ بھی صرف اس کے پروں کے لیے۔ بطخ یہ کام اس کے لیے خود بھی کرواتی ہے کیونکہ وہ اپنے پروں کو نوچنے کی عادی ہوتی ہے۔

یہ شکاری جس کا نام ہانس تھا، سٹی فلز کے دامن میں واقع گاؤں اسٹاپی تک ہماری رہنمائی کرنے والا تھا۔ ہمیں 16 جون تک اپنا سفر شروع کرنا تھا، یہ سفر سات یا آٹھ دن کا تھا۔ چچا کو، مجھے اور ہمارے سامان کو گھوڑوں پر جانا تھا جب کہ ہانس نے پیدل چلنے کا فیصلہ کیا تھا۔

طے یہ پایا تھا کہ اسٹاپی پہنچنے کے بعد بھی اگر چچا جان کو ضرورت ہوئی تو وہ اسے اپنے ساتھ رکھیں گے اور اس سے کام لیتے رہیں گے، اس معاہدے کے ساتھ کہ وہ اسے ہر ہفتے کی شام تین ڈالر بطور معاوضہ ادا کرتے رہیں گے۔

یہ معاہدہ نہایت آسانی سے طے پا گیا۔

"یہ نہایت شاندار آدمی ہے۔" چچا جان نے ہانس کے جانے کے بعد کہا۔

"تو یہ ہمارے ساتھ چلے گا اور..."

"ہاں البرٹ۔ یہ ہمارے ساتھ دنیا کی تہہ تک جائے گا۔" چچا جان نے میرا جملہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔

وہ جون کی 14 تاریخ تھی اس لیے ہم سارا دن اپنا سامان باندھتے رہے۔

سب آلات مثلاً حرارت پیما، قطب نما اور آلہ ٔ دباؤ وغیرہ ایک بکس میں۔ دوسرے میں بندوقیں اور ریوالور۔ تیسرے میں کلہاڑیاں، ہتھوڑیاں، فولادی سلاخیں اور رسیاں وغیرہ پیک کی گئیں۔ جبکہ چوتھے میں کھانے پینے کی چیزیں تھیں جو اتنی تھیں کہ ہم چھ مہینے تک انہیں استعمال کر سکتے تھے۔ مشروب کے طور پر چچا جان نے ایک قسم کی شراب لی رکھی تھی۔ وہ اپنے ساتھ پانی نہیں لے جا رہے تھے۔ ان کو توقع تھی کہ پانی کسی زیرِ زمین چشمے سے مل جائے گا۔

اس کے علاوہ ہمارے پاس دوائیں، تمباکو، رقم اور واٹر پروف جوتوں کے چھ جوڑے تھے۔

"ان کے ذریعے ہم ایک لمبا سفر کر سکیں گے۔" چچا جان نے کہا۔

اس شام ہم نے گورنر اور میئر کے ساتھ کھانا کھایا۔ چچا جان ان سے بات چیت میں مصروف رہے، لیکن ان لوگوں کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔

16 جون کو ہم نے سارا سامان باندھ لیا۔ ہمارے میزبان مسٹر ڈکسن نے چچا کو آئس لینڈ کا ایک اچھا سا نقشہ دیا۔ وہ شام ہم نے خوش گوار باتوں میں گزاری۔ مجھے معلوم تھا کہ اب جو رات آئے گی وہ اتنی خوش گوار نہیں ہوگی۔

اگلے دن صبح پانچ بجے گھوڑوں کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے پھرتی سے اپنا لباس تبدیل کیا اور نیچے سڑک پر گیا۔ وہاں ہانس مستعدی سے سامان کا آخری بکس گھوڑوں پر رکھوا رہا تھا۔ چچا جان اس کا ہاتھ کم بٹا رہے اور حکم زیادہ دے رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ ہانس ان کے احکامات پر کم ہی توجہ دے رہا ہے۔

چھ بجے تک ساری تیاری مکمل ہوگئی تو مسٹر ڈکسن نے ہم

لوگوں سے مصافحہ کیا۔ میرے چچا نے آئس لینڈ کی زبان میں ان کا شکریہ ادا کیا۔ جبکہ ان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میں نے لاطینی زبان استعمال کی۔ پھر ہم نے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگا دی۔ "جاؤ، جہاں تک تمھاری قسمت ساتھ دے۔" مسٹر ڈکسن نے اونچی آواز میں کہا۔

ہانس گھوڑوں کے آگے آگے چل رہا تھا اور اس کے چہرے سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ تھکا ہوا ہے۔ اس کے پیچھے دو گھوڑے تھے جن پر سامان لدا ہوا تھا اور اس کے بعد گھوڑوں پر ہم دونوں تھے۔ ریکیاوک سے نکلتے ہی ہانس ساحل کے کنارے چلنے لگا۔ وہاں کھیت اور چراگاہیں تھیں، مگر افسوس کہ وہ ہرے بھرے ہونے کے بجائے پیلے اور زرد تھے۔ ان کی گھاس اور پودے مرجھائے ہوئے تھے۔ ان کھیتوں میں چند بھیڑوں اور اِکا دُکا گایوں کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ مشرق کی طرف پہاڑوں پر دھند اور کہر تھی۔ جبکہ ان سے بھی پیچھے والے پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف جمی ہوئی تھی جو دور سے چمک رہی تھی۔

میں نے پلٹ کر چچا کی طرف دیکھا تو مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ ان کا قد لمبا تھا اور جس گھوڑے پر وہ بیٹھے تھے وہ چھوٹا تھا اس لیے عجیب سے لگ رہے تھے۔ "اچھا گھوڑا ہے، بہت اچھا گھوڑا ہے" وہ مسلسل کہہ رہے تھے۔ "ایلبرٹ، تمھیں آئس لینڈ کے گھوڑوں کے مقابلے میں کوئی اور گھوڑا اتنا ذہین اور جفاکش نہیں ملے گا۔ بادل ہو کہ بجلی، طوفان ہو کہ چٹان یا برفانی تودے یہ کہیں نہیں ٹھہرتا، ہر ایک کو پھلانگتا چلا جاتا ہے۔ ایک دن میں یہ تیس میل کا فاصلہ طے کرتا ہے۔"

ریکیاوک سے چلے ہوئے جب دو گھنٹے ہو گئے تو ہم ایک چھوٹے سے قصبے میں پہنچ گئے۔ ہانس تھوڑی دیر کے لیے رک گیا۔ پھر اس نے ہمارے ساتھ ناشتہ کیا۔ چچا نے راستے کے بارے میں اس سے جو کچھ پوچھا وہ مختصر انداز میں ہاں یا نہیں

میں اس کا جواب دیتا رہا۔

اس وقت چار بجے تھے اور ہم نے بیس میل کا فاصلہ طے کرلیا تھا۔ وہاں ایک کھاڑی تھی جو تقریباً دو میل چوڑی تھی۔ اس کی لہریں چٹانوں سے ٹکرا کر جھاگ اڑا رہی تھیں۔

"اگر یہ گھوڑے واقعی ذہین ہیں تو پھر سمندر کو پار کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔" میں نے کہا۔

مگر چچا جان نے میری ایک نہ سنی اور اپنے گھوڑے کو ڈانٹ ڈپٹ کر سمندر میں اترنے پر مجبور کیا، جس کے نتیجے میں گھوڑے نے انھیں اپنی پیٹھ سے اچھال دیا۔

"سمندر پار کرنے کے لیے کشتی مل جائے گی۔" گائیڈ نے کہا۔

"ارے تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا۔" چچا نے چونک کر کہا۔ "آؤ کشتی سے چلیں۔"

"ابھی سمندر میں لہریں اٹھ رہی ہیں اس لیے ٹھہرنا پڑے گا۔"

چچا بے چینی سے ٹہلنے لگے، مگر اس سے مسئلہ حل نہیں ہوا۔ معاملہ جوں کا توں رہا۔ سمندر میں لہروں کا زور شام کو چھ بجے ٹوٹا۔ اس وقت جب وہ پرسکون ہوگیا تو دو آدمیوں نے ایک گھنٹے میں ایک کشتی میں ہمیں دوسری طرف پہنچا دیا۔ ساڑھے سات بجے ہم فورڈ پہنچ گئے جہاں ہمیں رات بھر ٹھہرنا تھا۔

شام کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اندھیرا ہوگیا تھا۔ روشنی اب بھی ہو رہی تھی اس لیے کہ آئس لینڈ میں جون اور جولائی کے دوران سورج غروب نہیں ہوتا۔ بہرحال درجہ حرارت کافی کم ہوگیا تھا۔ جب ہم ایک غریب کسان کے دروازے پر جا کر ٹھہرے تو اس وقت مجھے بھوک اور سردی ستا رہی تھی۔

مالکِ مکان نے ہم سے ہاتھ ملایا اور پھر ہمیں سیدھا خواب گاہ میں لے گیا جہاں کچا فرش تھا اور لیٹنے کے لیے بھوسا بھرے ہوئے دو گدے پڑے تھے۔ اس نے ہمیں باورچی خانے تک چلنے کو کہا، چاروں کمروں میں وہی ایک جگہ تھی جہاں آگ جل رہی تھی۔ جب ہم باورچی خانے میں گئے تو میزبان اور اس کی بیوی نے کہا "خوش آمدید، تم لوگ خوش رہو۔" ان کے انیس بچے ہمارے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد چار ہماری گردنوں پر سوار تھے۔ ایک دو گھٹنوں پر اور باقی گود میں بیٹھے تھے۔

پھر ہم چوبیسوں کھانا کھانے بیٹھے۔ کھانا بہت عجیب تھا۔ مچھلی اور لسی تھی۔ مجھے بہرحال زور کی بھوک لگ رہی تھی اس لیے میں ساری مچھلی کھا گیا اور ساری لسی پی گیا۔

دوسرے دن صبح پانچ بجے ہم نے اپنے میزبانوں کو الوداع کہا اور اسے رات گزارنے کے کرایے کے طور پر رقم دینا چاہی جو اس نے مشکل ہی سے قبول کی۔

سفر شروع کرتے ہی احساس ہوا کہ آگے ویرانی ہے۔ راستے میں بہت کم انسان یا جانور دیکھنے کو ملے۔ فورڈ کا علاقہ طے کرنے کے بعد ہم نے رات ایک ویران جھونپڑی میں بسر کی۔ دوسرے روز بھی یہی منظر دکھائی دیا، مگر ہم نے کافی فاصلہ طے کرلیا اور رات کے وقت ہم اسنافیل سے آدھے فاصلے پر پہنچ گئے۔

19 جون کو ہم آتش فشاں سے نکلے ہوئے مردہ لاوے پر چل رہے تھے۔ پھر تھوڑی دیر بعد نمی شروع ہوگئی۔ اب ہم خلیج فیکسا کے ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے اور سنیفل کی سفید چوٹیاں جو بادلوں میں لپٹی ہوئی تھیں ہم سے صرف پانچ میل کے فاصلے پر رہ گئی تھیں۔ مجھ پر رفتہ رفتہ تھکن سوار ہو رہی تھی، لیکن

چچا جان اسی طرح سے تازہ دم تھے جیسا کہ رکیاوک سے چلتے وقت تھے۔ ہمارا گائیڈ بھی اس سفر کو کوئی خاص اہمیت نہیں دے رہا تھا۔

20 جون ہفتے کی شام کو ہم بوڈیر نامی گاؤں کے قریب پہنچ گئے جو ساحل سمندر پر واقع تھا۔ وہاں چچا جان نے ہانس کو طے شدہ معاہدے کے مطابق رقم ادا کی۔ وہ رات ہم نے ہانس کے خاندان کے ساتھ گزاری جو اسی گاؤں میں رہتا تھا۔ دوسری صبح ہم لوگ پھر چل پڑے۔ اب ہم سنیفلز کے بہت قریب پہنچ چکے تھے اور پروفیسر کی نگاہیں پہاڑ سے نہیں ہٹ رہی تھیں۔ "خوب تو یہ ہے وہ دیوقامت پہاڑ جسے میں شکست دینے والا ہوں۔" انھوں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

چار گھنٹے بعد گھوڑے استاپی کے علاقے میں داخل ہوئے اور پھر ایک کیبن کے دروازے پر پہنچ کر کھڑے ہو گئے۔ استاپی میں تقریباً تیس کیبن تھے۔ اس کے پیچھے پہاڑ شروع ہو جاتا تھا اس لیے وہاں قدرتی طور پر تیس فٹ اونچی ایک چٹان دیوار کی طرح کھڑی ہو گئی تھی۔ وہاں ہمیں جو کیبن رہنے کے لیے ملا وہ بہت گندا اور بے ترتیب تھا اور اس کا مالک ایک گنوار انسان تھا جو شراب بہت پیتا تھا۔ چچا جان چاہتے تھے کہ وقت ضائع کیے بغیر جلد از جلد شروع کیا جائے جس کے لیے ہانس نے دوسرے دن تین آدمیوں کی خدمات حاصل کیں جنھیں ہمارا سامان اٹھا کر پہاڑ کے دہانے کے اندر جہاں تک ہو سکے پہنچانا تھا۔

میں اس بات سے پریشان تھا کہ ممکن ہے آتش فشاں سنیفلز مردہ نہ ہو اور جب ہم لوگ دہانے پر پہنچیں تو وہ اچانک جاگ جائے اور لاوا اگلنا شروع کر دے۔ میں نے اپنے اس خدشے سے چچا جان کو آگاہ کیا۔

"میں بھی اس بارے میں سوچ رہا ہوں۔" انھوں نے کہا۔ کیا واقعی وہ اس مسئلے پر غور کر رہے تھے اور اس سفر کو

ترک کرنے والے تھے؟

"میں اس بارے میں سوچ رہا تھا۔" انھوں نے اپنی بات دہرائی۔ "سینٹ ہیلنز گزشتہ چھ سو سال سے خاموش ہے، لیکن ہوسکتا ہے کہ یہ اچانک پھٹ پڑے۔ مگر آتش فشاں کے پھٹنے سے پہلے زمین میں جو تبدیلی آتی ہے اور اس کے آثار ظاہر ہونا شروع ہوتے ہیں وہ نہیں ہو رہے ہیں۔ میں نے اس معاملے پر قصبے والوں سے بھی بات کی ہے اور خود بھی زمین کا مشاہدہ کیا ہے۔ میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ البرٹ کہ آتش فشاں کے پھٹنے کے امکانات نہیں ہیں۔"

میں حیرت سے گنگ رہ گیا۔

"تمھیں میری بات کا یقین نہیں آیا۔" چچا جان نے کہا "اچھا میرے ساتھ آؤ۔"

ہم کیبن سے نکل آئے اور سمندر سے کافی دور ایک شگاف سے اندر گئے۔ وہاں آتش فشانی چٹانوں سے جگہ جگہ بھاپ اٹھ رہی تھی۔

"تم اس بھاپ کو دیکھ رہے ہو البرٹ؟ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آتش فشاں نہیں پھٹے گا۔"

"میں سمجھ نہیں پایا کہ اس سے یہ کیسے ثابت ہوتا ہے؟"

"سنو۔" پروفیسر نے کہا" آتش فشاں پھٹنے والا ہوتا ہے تو یہ بھاپ زیادہ مقدار میں نکلنے لگتی ہے اور اطراف کی ہوا ساکت اور بھاری ہو جاتی ہے۔"

"مگر......"

اس میں اگر مگر کی گنجائش نہیں ہے۔ میں نے تمھیں ایک سائنسی اصول بتایا ہے۔ اس کے سامنے کسی شخص کو اپنی زبان نہیں کھولنا چاہیے۔"

میں چچا جان کے ساتھ کیبن واپس آگیا۔ میں خود کو معتدل محسوس کر رہا تھا۔ اب لے دے کے یہی امید رہ گئی تھی کہ جب ہم آتش فشاں کے دہانے کے قریب پہنچیں اور اپنے سفر کا آغاز کرنے لگیں تو ہمیں راستہ نہ ملے۔ اس رات مجھے بھیانک خواب نظر آتے رہے۔ میں نے دیکھا کہ آتش فشاں ایک ہول ناک آواز کے ساتھ پھٹ گیا ہے اور میں فضا ہی میں اس کے لاوے میں جل بھن کر مر گیا ہوں۔

دوسرے دن 23 جولائی کو ہانس تین آدمیوں کے ساتھ ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ہمارے سامان میں اس نے چمڑے کی ایک بوتل کا اضافہ کیا تھا جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ یہ پانی ہمارے ذخیرے کے علاوہ تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ پانی کا یہ ذخیرہ ایک ہفتے کے لیے کافی ہوگا۔

صبح نو بجے جب ہم رخصت ہونے لگے تو چچا جان نے میزبان کو منہ مانگی رقم ادا کر دی۔

سینٹ ہیلنز پر چڑھائی

سینٹ ہیلنز پانچ ہزار فٹ بلند ہے۔ جب ہم بالکل اس کے دامن میں پہنچ گئے تو میں نے سر اٹھا کر اس کی چوٹی کو دیکھنا چاہا لیکن خاکستری آسمان کے پس منظر میں وہ نظر نہیں آئی۔ مجھے ایسا دکھائی دیا جیسے پہاڑ نے برف کی ٹوپی پہن رکھی ہو۔

ہانس کی رہنمائی میں ہم ایک تنگ راستے پر آگے پیچھے چلے جا رہے تھے، وہ راستہ اتنا تنگ تھا کہ دو آدمی برابر نہیں چل سکتے تھے۔ اس لیے ایک دوسرے سے بات چیت بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ ہم جس راستے سے گزر رہے تھے اس کے اطراف کا نظارہ کرنے کے لیے میرے پاس کافی وقت تھا۔ جیسے جیسے میرے مشاہدے میں اضافہ ہو رہا تھا، ویسے ویسے میرا اعتماد بڑھتا جا رہا تھا۔ بلاشبہ وہ آتش فشاں پہاڑ تھا، وہاں پائی جانے

والی گرمی کی وجہ سے کوئی احمق ہی اس کے دہانے سے اندر اترنے کی کوشش کرے گا۔

رفتہ رفتہ راستہ دشوار ہوتا چلا گیا۔ چڑھائی شروع ہو چکی تھی۔ چٹانیں ہمارے قدموں تلے دب کر ٹوٹ رہی تھیں اور یہ صورت حال بے حد خوف ناک تھی!

ہانس اس چڑھائی کو اس طرح سے طے کر رہا تھا جیسے کسی ہموار جگہ پر چل رہا ہو۔ بعض اوقات وہ کسی بڑی چٹان کے پیچھے غائب ہو جاتا تھا پھر وہ تیز سیٹی بجاتا تو ہمیں معلوم ہوتا کہ اس وقت وہ کہاں ہے۔ یہ اس بات کا اشارہ ہوتا کہ اب ہمیں کدھر جانا ہے۔ تین گھنٹے تک چلنے کے بعد ہم پہاڑ کے دامن میں پہنچ گئے۔ وہاں ہانس نے ہمیں ٹھہرنے کا حکم دیا اور پھر سب کو ناشتے کے طور پر تھوڑا تھوڑا کھانے کو دیا۔ چچا جان نے جلدی جلدی کھا لیا اور پھر آرام کرنے لگے اس لیے کہ سب لوگ تھک گئے تھے اور ہانس کی تجویز تھی کہ آرام کرنا مناسب ہوگا۔ طے یہ پایا کہ ایک گھنٹے بعد دوبارہ سفر شروع کیا جائے گا۔ ہانس کے ساتھ آئے ہوئے تین مزدور جن کا تعلق آئس لینڈ سے تھا، وہ ہانس کی طرح ہی تھے۔ وہ بات چیت کم کرتے تھے اور ان کی خوراک بھی کم تھی!

جب سفر دوبارہ شروع ہوا تو سنیفل کی چڑھائی طے کرنا پڑی۔ سر اٹھا کر دیکھنے پر معلوم ہوتا تھا کہ اس کی چوٹی بے حد قریب ہے، مگر وہاں تک پہنچنے کے لیے ابھی کتنے گھنٹے لگنا تھے، یہ کسی کو اندازہ نہیں تھا۔ چھوٹے موٹے پتھر اب بھی ہمارے قدموں تلے آ کر پھسلتے ہوئے نیچے جا رہے تھے۔ بعض اوقات ایسی عمودی چٹانیں ہمارے سامنے آ جاتی تھیں کہ ہم ان پر نہیں چڑھ پاتے لہٰذا ہمیں گھوم کر راستہ طے کرنا پڑتا۔ ہمارے ہاتھوں میں نوک دار فولادی سلاخیں تھیں جن کے سہارے ہم راستہ طے کر رہے تھے۔ چچا جان میرے قریب ہی تھے اور انھوں نے کئی موقعوں پر مجھے سہارا دیا۔ وہ نہایت اچھی طرح

سے اپنا توازن برقرار رکھے ہوئے تھے۔ یہی حال آئس لینڈ کے تین باربردار مزدوروں کا تھا۔ انھوں نے بھاری سامان لاد رکھا تھا، لیکن وہ بہت آسانی سے پہاڑ پر چڑھ رہے تھے۔

ایک گھنٹے کے بعد خوش قسمتی سے برفانی راستے پر ہمیں قدرتی زینہ سا مل گیا۔ اس سے سفر میں آسانی ہوگئی۔ شام تک ہم تقریباً دو ہزار سیڑھیاں چڑھ چکے اور اس مقام پر پہنچ چکے تھے جہاں سے سنی فلز کا دہانہ شروع ہوتا تھا۔

اس وقت ہم سمندر سے بتیس سو فٹ کی بلندی پر تھے۔ ہوا تیز اور سرد تھی اور میں بہت تھک چکا تھا۔ چچا حالانکہ جلد بازی کا مظاہرہ کرتے تھے اور ہر وقت ایک ہیجان میں مبتلا تھے، لیکن انھوں نے بھی ٹھہرنے کا فیصلہ کیا اور گائڈ کے سامنے یہ تجویز پیش کی۔ لیکن ہانس نے انکار میں سر ہلایا "اور اوپر" اس نے کہا

"کیوں؟" چچا نے پوچھا۔

"گرد وغبار کا طوفان آنے والا ہے؟"

"ہاں۔" باقی تین مزدوروں نے بھی خوف زدہ آواز میں اس کی تائید کی۔

"وہ کیسا ہوتا ہے؟" میں نے تشویش سے پوچھا۔

"وہ دیکھو۔" چچا جان نے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں نے اس طرف دیکھا تو گرد وغبار کا ایک بہت اونچا مینار فضا میں بل کھاتا ہوا پہاڑ کی چوٹی کی طرف آتا نظر آیا۔ غبار اتنا تھا کہ سورج اس میں چھپ گیا تھا۔

"جلدی کرو..... بھاگو....." ہانس نے کہا۔

ہم سے جتنا تیز ہوسکا ہم ہانس کے پیچھے بھاگنے لگے۔ جلد ہی گرد وغبار کا طوفان پہاڑ تک آگیا۔ چھوٹے بڑے بڑے پتھر ہوا کے زور سے اپنی جگہوں سے پھسلے اور بارش کی طرح سے نیچے برسنے لگے۔ اگر وہ پتھر ہمارے جسموں پر پڑ جاتے تو ہمارے ٹکڑے اڑ جاتے۔ ہم ہانس کے شکرگزار تھے کہ اس کی وجہ سے بچ گئے۔ اب ہم دوسری طرف تھے اور خطرے سے محفوظ!

مگر ہانس کا خیال تھا کہ وہاں ٹھہرنا دانش مندی نہیں ہے۔ اس لیے ہم مسلسل چڑھائی چڑھتے رہے اور چاروں طرف گھوم کر راستے طے کرتے رہے۔ اس طرح سے باقی ڈیڑھ ہزار فٹ طے کرنے میں ہمیں تقریباً پانچ گھنٹے لگے۔ سردی اور بھوک کی وجہ سے میں تھکن اور کمزوری محسوس کر رہا تھا اور ٹھیک طرح سے اتنی بلندی پر سانس نہیں لے پا رہا تھا۔

بالآخر گیارہ بجے رات کو، جب ہر طرف مکمل تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ہم سنی فلز کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ اس کے دہانے میں پناہ لینے سے پہلے مجھے نیچے آدھی رات کا سورج طلوع ہوتا دکھائی دیا۔

ہم نے جلدی سے کھانا کھایا اور سونے کی تیاری کرنے لگے۔ بستر سخت تھا اور لیٹتے وقت مجھے آرام نہیں ملا۔ سمندر سے پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر ایسی پناہ گاہ بھی نہیں مل سکی تھی کہ ہم ٹھیک طریقے پر آرام کر سکتے، مگر اس کے باوجود میں سو گیا۔ پھر مجھے اتنی گہری نیند آئی کہ کوئی خواب تک نظر نہیں آیا۔

دوسری صبح بیدار ہونے پر تیز ہوا کی وجہ سے ہاتھ پاؤں منجمد محسوس ہوئے، مگر اطمینان بخش بات یہ تھی کہ سورج طلوع ہو چکا تھا اور چمک دار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے پتھر کے بستر سے اٹھ گیا تاکہ اس خوبصورت منظر کو دیکھ سکوں۔

اس وقت میں سنی فلز کی جنوبی چوٹی پر کھڑا تھا۔ وہاں سے آئس لینڈ کا بیشتر علاقہ نظر آ رہا تھا۔ نیچے گہری وادیاں تھیں اور جھیلیں تالاب جیسی دکھائی دے رہی تھیں جبکہ دریاؤں پر

چشموں کا گمان ہوتا تھا۔ میرے دائیں جانب مشرق میں، گلیشیئر اور برف سے لدی چوٹیاں تھیں۔ انھیں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بپھرے ہوئے سمندر میں کسی نے لہریے ڈال دیے ہوں۔ جبکہ بائیں جانب مغرب میں سمندر پھیلا ہوا تھا۔ یہ بتانا دشوار تھا کہ خشکی ختم ہوتی ہے اور سمندر کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ دوری کی وجہ سے خشکی اور سمندر ایک دوسرے میں پیوست لگ رہے تھے۔ میں اس منظر کو دیکھ کر محو ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہانس اور چچا جان میرے قریب آ گئے۔

"اب ہم سنی فلز کی چوٹی پر پہنچ چکے ہیں۔" چچا نے کہا "یہاں دو چوٹیاں ہیں۔ ہانس ہمیں بتائے گا کہ آئس لینڈ کے رہنے والے اس کو کیا کہتے ہیں جس پر اس وقت ہم کھڑے ہیں۔"

"اسکارٹرس" ہانس بولا۔

میرے چچا نے فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھا۔ "اور اب ہم اس کے اندر داخل ہو کر آگے بڑھیں گے۔" انھوں نے اونچی آواز میں کہا۔ سنی فلز کا دہانہ تقریباً ایک میل چوڑا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس کی گہرائی تقریباً دو ہزار فٹ ہوگی اور تہ میں پہنچ کر اس کی چوڑائی کم ہو کر پانچ سو فٹ رہ جائے گی۔ اس لیے اس میں اترنا کوئی مشکل نہیں تھا۔

میں چونکہ آتش فشاں کی چوٹی پر کھڑا تھا لہٰذا مجھے ایک بار پھر اس میں سے نکلنے والے لاوے اور قیامت برپا کرنے والی آگ کا خیال آیا، مگر اب میں واپس نہیں جا سکتا تھا۔ ہانس ہماری رہنمائی کرنے لگا اور میں خاموشی سے اس کے پیچھے چلنے لگا۔

اس مخروطی جگہ میں ہم گھومتے ہوئے اترنے لگے۔ اندر جہاں جہاں برف کے تودے اور گلیشیئر تھے وہاں ہانس بہت احتیاط سے راستہ طے کر رہا تھا اور اپنی فولادی سلاخ کو چٹانوں پر مار کر ان کی مضبوطی کا اندازہ کرتا جا رہا تھا۔ بعض جگہوں پر ہم نے ایک دوسرے کو رسی سے باندھ لیا تا کہ اگر کوئی پھسل جائے تو دوسرے اسے بچا سکیں۔

دوپہر کے وقت ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سے پہاڑ کا دہانہ ایک دائرے کی صورت میں نظر آ رہا تھا اور اس میں سے آسمان چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کی طرح دکھائی دے رہا تھا، جب کہ ہمارے چاروں طرف اسکارٹرس کی بلندی تھی۔ ہم خود کو کسی کنویں میں کھڑا محسوس کر رہے تھے۔

اس پہاڑ کی تہ میں تین چمنیاں تھیں۔ آتش فشاں پھٹنے کی صورت میں ان سے لاوا نکلتا تھا۔ ان میں سے ہر ایک چمنی کا دہانہ تقریباً سو فٹ چوڑا تھا۔ مجھے ان چمنیوں کے نزدیک جانے کی ہمت نہیں ہوئی، مگر چچا جان ہیجان میں کبھی ایک اور کبھی دوسری چمنی کی طرف دوڑتے تھے۔ جذبات میں وہ بڑبڑاتے اور ہاتھ پاؤں ہلاتے جا رہے تھے۔ ہانس اور میں خشک لاوے کے بلاکوں پر بیٹھ گئے اور انھیں دیکھنے لگے۔ ہم دونوں کا خیال تھا کہ ان کا دماغ چل گیا ہے۔

اچانک چچا جان چلائے۔ پہلے مجھے خیال ہوا کہ وہ ان میں سے کسی دہانے میں گر گئے ہیں، مگر پھر میں نے انھیں مسرت سے ہاتھ پھیلائے گرینائٹ کی ایک چٹان کے سامنے کھڑا دیکھا۔ "ایلیرٹ.....! ایلیرٹ۔" انھوں نے تقریباً چیختے ہوئے کہا "یہاں آؤ۔ یہاں آؤ۔"

میں دوڑ کر ان کے قریب گیا جبکہ ہانس نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔

"دیکھو۔" چچا جان نے کہا۔

میں نے ان کے جوش و خروش سے مجبور ہو کر اس چٹان کی طرف دیکھا تو اس پر ایک منحوس نام کھدا ہوا نظر آیا۔ آرنی سیکنسم! "کیا اب بھی تمھیں کوئی شبہ ہے؟" انھوں نے میرا

شانہ ہلا کر کہا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور جا کر دوبارہ ہانس کے قریب بیٹھ گیا۔ پھر جب میں نے تھوڑی دیر بعد اپنا سر اٹھایا تو وہاں صرف چچا جان اور ہانس نظر آئے۔ بار برداری کے لیے آنے والے تینوں مزدور واپس جاتے دکھائی دیے۔

ہانس ایک چٹان کے نیچے سکون سے سو رہا تھا جبکہ چچا جان آتش فشاں کی تہہ میں کسی چوپائے کی طرح بے قراری سے چکر کاٹ رہے تھے۔ مجھے ان کے قریب جانے کی خواہش نہیں تھی اور نہ ہی ہمت۔ اس لیے میں بھی سو گیا، مگر بے سکونی رہی۔ مجھے اس خیال نے پریشان کر رکھا تھا کہ آتش فشاں کسی بھی لمحے کانپنے لگے گا اور لاوا پھوٹ پڑے گا۔

آتش فشاں میں یہ ہماری پہلی رات تھی!

دوسرے دن پہاڑ کے دہانے سے جتنا آسمان نظر آیا اس پر گہرے خاکستری بادل تھے۔ میں نے اس طرف مجبوراً دیکھا تھا اس لیے کہ چچا غصے سے بڑبڑا رہے تھے۔ وہ تین راستے جو اب ہمارے قدموں تلے تھے آرنی ان میں سے کسی ایک میں گیا تھا، وہ راستہ جس پر نقشے کے مطابق جون کے آخر میں اسکارٹرس کا سایہ پڑتا ہے۔ انھیں اس بات کا غصہ تھا کہ اگر سورج نہیں نکلا تو پھر پہاڑ کی چوٹی کا سایہ نیچے کیسے پڑے گا۔ اس روز چھبیس جون تھا۔ اگر آسمان پر چھ روز تک بادل چھائے رہتے تو اس بارے میں کچھ پتا نہ چلتا اور معاملہ اگلے سال پر چلا جاتا!

دن تیزی سے گزر رہا تھا، مگر بادل چھائے ہوئے تھے اور دھوپ اندر تک نہیں آ رہی تھی۔ ہانس نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی البتہ اسے حیرت تھی کہ ہم وہاں رک کر کیا کر رہے ہیں۔ چچا جان نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی اور سر اٹھائے آسمان کی طرف دیکھتے رہے۔

چھبیس جون کو بھی سورج نظر نہیں آیا اور سارا دن بارش ہوتی رہی۔ ہانس نے لاوے کی چٹانوں کو جوڑ کر چھوٹی سی جھونپڑی بنالی جبکہ میں خوش ہو کر آسمان کو دیکھتا رہا، ہلکی ہلکی بارش دہانے سے اندر آ رہی تھی۔ میرے چچا اس صورت حال سے دل برداشتہ تھے۔

ستائیس جون کو بھی یہی صورت رہی، مگر اٹھائیس تاریخ کو موسم تبدیل ہونا شروع ہوا۔ بادل چھٹ گئے اور پہاڑ کے دہانے سے سورج دکھائی دینے لگا۔ دھوپ اندر آ رہی تھی اور ہر چٹان اور ہر پتھر کا سایہ تہہ پر پڑ رہا تھا۔ اسکارٹرس کا سایہ واضح تھا اور کسی بلیڈ کی طرح سے نوکیلا، وہ سورج کے ساتھ ساتھ حرکت کر رہا تھا۔

میرے چچا بھی اس کے ساتھ چل رہے تھے۔

آدھا دن گزرنے کے بعد اس چٹان کا سایہ بیچ والی چمنی پر پڑنے لگا۔

"وہ رہا وہ رہا۔" چچا جان چلائے۔ "اس راستے سے ہم زمین کی تہہ تک پہنچ سکتے ہیں۔"

میں نے ہانس کی طرف دیکھا۔

"آگے چلیں؟" ہانس نے پوچھا۔

"ہاں آگے چلو۔" چچا بولے۔

اس وقت ایک بج کر تیرہ منٹ ہوئے۔

■

(جاری)

ماخذ: زمین کی تہہ میں (جولز ورنے کے ناول کا ترجمہ)، مترجم: شکیل صدیقی، ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، اشتراک: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

اچھا استاد

اچھے استاد کا امتیاز یہی ہے کہ اس کی زندگی کی جڑیں محبت کے چشمے سے سیراب ہوتی ہیں اس لیے یہ وہاں امید رکھتا ہے جہاں دوسرے امید چھوڑ دیتے ہیں۔ وہاں تازہ دم رہتا ہے جہاں دوسرے تھک جاتے ہیں۔ اُسے وہاں روشنی دکھائی دیتی ہے جہاں دوسرے اندھیرے کی شکایت کرتے ہیں۔

یہ زندگی کی کوششوں کو بھی دیکھتا ہے لیکن اس کی وجہ سے بلندیوں کو بھول نہیں جاتا اور بڑوں کی قدر کے ساتھ ساتھ چھوٹوں کی قدر کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کرتا۔ خوفِ حشر کا تصور بھی سامنے رکھتا ہے مگر نادان اور بے کس بچوں کی خدمت کو اپنی زندگی کا افتخار جانتا ہے اور بچے کی زندگی سے جب ساری دنیا مایوس ہو جاتی ہے تو بس دو آدمی ہیں جن کے سینے میں امید باقی رہتی ہے۔ ایک اس کی 'ماں' اور دوسرا 'اچھا استاد'۔

■

Tabassum Be Shaikh Khalil
Al-Hasanat Urdu High School
Rasulpur (Maharashtra)

کچھ اہم عالمی دن

نمبر	دن	تاریخ
1۔	ورلڈ سکاؤٹنگ ڈے	22 فروری
2۔	عالمی یوم خواتین	08 مارچ
3۔	عالمی پانی کا دن	22 مارچ
4۔	عالمی ٹی بی کا دن	24 مارچ
5۔	عالمی یوم صحت	07 اپریل
6۔	ورلڈ ارتھ ڈے	22 اپریل
7۔	محنت کشوں کا دن	01 مئی
8۔	عالمی یوم ماحول	05 جون
9۔	انسداد منشیات	26 جون
10۔	بین الاقوامی امداد باہمی کا دن	01 جولائی
11۔	عالمی آبادی کا دن	11 جولائی
12۔	عالمی یوم خواندگی	08 ستمبر
13۔	عالمی یوم سیاحت	27 ستمبر
14۔	عالمی یوم سکونت	اکتوبر کا پہلا پیر
15۔	استادوں کا عالمی دن	05 اکتوبر
16۔	ذہنی صحت کی آگاہی کا دن	10 اکتوبر
17۔	عالمی یوم معیار	14 اکتوبر
18۔	سفید چھڑی کا عالمی دن	15 اکتوبر
19۔	غربت مٹاؤ کا بین الاقوامی دن	17 اکتوبر
20۔	اقوام متحدہ کا دن	24 اکتوبر
21۔	ذیابیطس کا عالمی دن	13 نومبر
22۔	عالمی یوم بچگان	20 نومبر
23۔	ایڈز کا عالمی دن	01 دسمبر
24۔	رضاکاروں کا عالمی دن	05 دسمبر
25۔	انسانی حقوق کا عالمی دن	10 دسمبر

■

Ansari Mohammad Anas Mahmood Husain
Moulvi Ganj, Near Suraj Mill Gate
Shaikhul Hind Chowk
Distt.: Dhule - 424001 (Maharashtra)

بڑے لوگ بڑی باتیں

مہاتما بدھ

انسانی زندگی دکھوں سے بھری پڑی ہے۔ اگر ان سے چھٹکارہ چاہتے ہو تو گیان میں دل لگاؤ۔

سکھ حاصل کرنا چاہتے ہو تو مطمئن رہو کیونکہ اطمینان سب سے بڑا سکھ ہے۔

اچھے لوگوں کی نشانی خوش کلامی ہے۔ بدکلامی تو جانوروں تک کو پسند نہیں آتی۔

نفرت کو محبت سے کم کرو، کیونکہ نفرت نفرت سے کبھی کم نہیں ہوتی۔

لگن سے علم حاصل کرو۔ لگن کی کمی سے علم کھو جاتا ہے۔

انسانوں کی خدمت کرنا اور وہ بھی بے لوث انسانیت کی معراج ہے۔

گناہ سرزد ہو جائے تو نہ اسے دہراؤ نہ چھپاؤ۔ گناہوں کا اندوختہ ہی تمام دکھوں کی بنیاد ہے۔

کسی بے جان دیوتا کے آگے سو سال عبادت کرنے سے بہتر ہے کہ چند لمحے کسی پرہیزگار کی صحبت میں گزار لو۔

بھگت کبیر

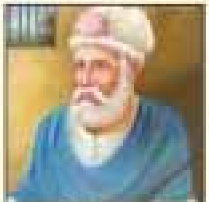

خدا کی محبت اور انسان دوستی میں ذریعہ نجات ہے۔

کسی پر زبردستی کرنا ظلم ہے۔ ایسا مت کر۔ ایسا کرنے والوں کو جواب دینا پڑے گا۔

خدا نے نور پیدا کر کے اپنی قدرت کاملہ سے ساری مخلوق بنائی اور ایک ہی نور سے بنائی۔ ایسے میں ہم کسی کو کمتر یا بڑا کس طرح کہہ سکتے ہیں۔

بھرتری ہری

جس طرح چاند اپنے آپ ہی چاندنی پھیلا دیتا ہے، سورج خود بخود کنول کے پھول کھلا دیتا ہے۔ اسی طرح نیک انسان بھی اپنے آپ دوسروں کی بھلائی کے کام کرتا ہے۔

اچھی عورت وہ ہے جس سے آرام ملے۔ اچھا دوست وہ ہے جس پر اعتماد ہو اچھا بیٹا وہ ہے جو ماں باپ کا فرماں بردار ہو۔

دولت صرف اپنی حفاظت اور مصیبت دور کرنے کے لیے جمع کرنا چاہیے۔

عقل مند کے ساتھ خطرے میں کود جانا بے وقوف کے ساتھ سیر کو نکل جانے سے بہتر ہے۔

بغیر علم والے لوگ، بغیر ہنر اور خوبی والے لوگ اور وہ لوگ جنھوں نے روحانی ترقی بھی نہ کی زمین پر بوجھ ہیں اور وہ صرف خام آدمی ہیں۔

تلسی داس

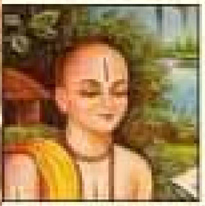

مصیبت سب سے بڑی کسوٹی ہے جس پر دوست یار پرکھے جا سکتے ہیں۔

اگر ہم خود بھی دوسروں کو کی جانے والی نصیحتوں پر عمل کریں تو بہت کچھ بن جائیں۔

نفس کے چکر میں پڑ کر انسان سب کو بھلا دیتا ہے۔

بابا گرو نانک جی

نیکی میرا مذہب ہے۔

اے جاہل نادان! اپنے نسب پر غرور نہ کر اس کے نتائج بہت برے ہیں۔

جو دوسروں سے کینہ و نفرت رکھتا ہے۔ اس کا دل بھی صاف نہیں ہو سکتا۔ وہ دن رات چاہے جتنے بھی کام کرے انھیں اطمینان نہیں ملتا۔

ہندو اور مسلم ایک ہی خدا کے بندے ہیں۔

سب سے بہتر وراثت جو آئندہ نسلوں کے لیے چھوڑی جا سکتی ہے وہ اچھا چال چلن بلند کردار ہے۔

جو گناہ کا مرتکب ہوا سے آدمی سمجھو جو گناہ کرکے نادم و پریشان ہو اسے ولی سمجھو اور جو گناہ کرکے اترائے اسے شیطان سمجھو۔

اے بھائی! دوسروں کا برا چاہنا چھوڑ دے۔

اگر دل میلا ہے تو سب کچھ ناپاک ہے۔ جسم دھونے سے دل پاکیزہ نہیں ہوتا۔

گاندھی جی

تھوڑا سا جھوٹ بھی انسان کو ملیامیٹ کر دیتا ہے، جیسے ایک کڑا ہی دودھ کو ایک بوند زہر۔

عورت کی کتاب دنیا ہے، وہ کتابوں سے اتنا نہیں سیکھتی جتنا دنیا سے سیکھتی ہے۔ مرد کتابیں پڑھتے ہیں۔ عورت دنیا کا مطالعہ کرتی ہے۔

مجھے جو خدا بھگوت گیتا میں نظر آتا ہے، وہی انجیل مقدس اور قرآن مجید میں بھی نظر آتا ہے۔

جرم انسان کے چہرے پر لکھا ہوتا ہے۔ نفرت جرم سے کرنا چاہیے۔ مجرم سے نہیں۔

انسانی بہتری کے لیے نت نئے کرم کرتے رہنا سب سے بڑا دھرم ہے۔

جواہر لعل نہرو

عمل کے بغیر اصول ذہنی عیاشی ہے اور اصول کے بغیر عمل اندھے کی ٹٹول ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ میں کسی کو ناپسند نہیں کرتا، کیونکہ بہر حال وہ کسی کی پسند ہے۔

جس گھر میں عورت دکھی رہتی ہے وہ گھر تباہ ہو جاتا ہے۔

ہر وہ فعل جس کا انجام اچھا اور دل کو سکون دینے والا ہو دھرم ہے۔

سوامی دیانند

جھوٹ دوسروں کو خوش کرنے کے لیے بھی نہ بولو۔

انسان کو نفس پرستی سے بری ہونا چاہیے۔

انسان اپنے آپ کو باندھنے کے لیے اپنے ہی ہاتھوں سے زنجیریں تیار کرتا ہے۔

مقصد کی سچی لگن مشکلات میں بھی مایوس نہیں ہونے دیتی۔

■

بشکریہ: اقوال زریں، اقبال سا جبرلائبریری ڈاٹ نیٹ

مہکتی کلیاں

(1) لوگوں کے دلوں میں اپنا مقام اس طرح بنالو کہ مر بھی جاؤ تو تمھارے لیے روئیں اور اگر زندہ رہو تو تم سے ملنا پسند کریں۔

(2) گناہ گار جب توبہ کے لیے اللہ کو پکارتا ہے تو اس سے پیاری کوئی آواز نہیں۔

(3) روزی بڑھنے کی دعا نہ مانگو بلکہ رزق میں برکت کی دعا مانگو۔

(4) مسکراہٹ ایک ایسا تحفہ ہے جو دینے والے کو مفلس کیے بغیر پانے والے کو بھی بہت کچھ دیتی ہے۔

(5) خوشی کا دروازہ اس گھر پر بند ہے جہاں سے عورت کی آواز زور زور سے آتی ہے۔

(6) ان لوگوں کو سلام نہ کرو جو ایک دوسرے کو ماں بہن کی گالیاں دے کر خوش ہوتے ہیں۔

(7) خاموشی غصے کا بہترین علاج ہے۔

(8) ببول کے پتوں جیسا نہ بنو جو وقت آنے پر سوکھ کر گر جاتے ہیں۔ بنو تو مہندی کے پتوں کی طرح جو خود پس کر بھی دوسروں کی زندگی میں رنگ بھر دیتے ہیں۔

(9) لوگ پیار کے لیے ہوتے ہیں اور چیزیں استعمال کے لیے۔ بات تب بگڑتی ہے جب چیزوں سے پیار اور لوگوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔

■

Nida Tahreem Sajid Husain
Madhve Pura Pul ke pass
Dhuleya (MS)

متفرق اقوال

- وقت سب کو ملتا ہے زندگی بدلنے کے لیے لیکن زندگی دوبارہ نہیں ملتی وقت بدلنے کے لیے۔
- جب بھی فارغ وقت ملے تو اپنی ماں کے پاس جاکر بیٹھ جایا کرو کیونکہ ماں کے ساتھ گزارا ہوا وقت قیامت کے دن نجات کا باعث بنے گا۔
- نیک بننے کے لیے ایسی کوشش کرو جیسی کوشش خوبصورت دکھنے کے لیے کرتے ہو۔
- اگر تم اپنے تکبر کو توڑنا چاہتے ہو تو کسی غریب یا مفلس کو سلام کیا کرو۔
- موت سب سے بڑی حقیقت ہے جس کو ہر شخص بھلا بیٹھتا ہے اور زندگی سب سے بڑا دھوکا ہے جس کے پیچھے ہر شخص بھاگ رہا ہے۔
- اگر تم کسی کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو جاتے ہو تو یہ نہ سمجھنا وہ کتنا بیوقوف ہے بلکہ یہ سوچنا کہ اس کو تم پر کتنا اعتبار تھا۔
- جھوٹ بول کر جیت جانے سے اچھا بہتر ہے کہ سچ بول کر ہار جاؤں۔
- جس گھر میں تعلیم یافتہ اور نیک ماں ہوتی ہے وہ گھر انسانیت اور تہذیب کی یونیورسٹی ہے۔
- دو مسلمانوں میں صلح کرانے کی کوشش کرو چاہے اس کے لیے تمھیں میلوں پیدل چلنا پڑے۔
- محبت کا سبق بارش سے سیکھو جو پھولوں کے ساتھ ساتھ کانٹوں پر بھی برستی ہے۔

■

Mohammad Miran Khan
B.Z Urdu High School
& Jr. College BSL - 425201 (Maharashtra)

محمد اکرم ظفیر

پاپا! میں فرسٹ آیا ہوں

حامد نے گاؤں میں مکتب کی پڑھائی پوری کر لی تو اس کے ابو نے اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے شہر میں قائم ایک بڑی اسلامی درسگاہ میں کرانے کا ارادہ کیا۔ حامد پڑھنے لکھنے میں بہت تیز تھا لیکن تھوڑا شرارتی بھی تھا۔ جب وہ اپنے گھر سے نکل رہا تھا اس وقت اسے اپنے دوستوں کی یاد کچھ زیادہ ہی ستا رہی تھی۔ دوستوں کے ساتھ کھیلنا کودنا، دیر رات تک ایک ساتھ بیٹھ کر باتیں کرنا وغیرہ اس کے دماغ میں گردش کر رہی تھیں۔ بوجھل قدموں کے ساتھ گھر سے نکلا۔ ایسی جگہ پہنچا جہاں اس کے سامنے نئے چہرے، نیا ماحول، بڑی بڑی عمارتوں کے بیچ خود کو اکیلا محسوس کر رہا تھا۔ کچھ دن گزرنے کے بعد حامد شام کے وقت اکیلے ایک جگہ بیٹھ کر سوچنے لگا کہ آخر میرے والدین نے گاؤں سے دور یہاں کیوں لا کر رکھ دیا؟ ہم نے تو مکتب کی پڑھائی پوری ہی کر لی تھی۔ کیا ضرورت ہے آگے اور پڑھنے کی؟

کچھ دیر بعد اس کے دل نے جواب دیا: "تمہیں تمہارے والدین نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے بھیجا ہے تاکہ تم پڑھ لکھ کر اعلیٰ مقام پر فائز ہو سکو اور والدین کا نام روشن کر سکو اور یہ بات بھی یاد رکھو کہ تعلیم دنیا کی ایسی دولت ہے جس کا مقابلہ بڑی سے بڑی شے نہیں کر سکتی۔ ایسا علم جس کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم علیہ السلام کا سجدہ کرے۔"

ان سب باتوں کو یاد کر کے حامد کے ارادوں میں مضبوطی آ گئی۔ اس نے ٹھان لیا کہ میں یہاں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ہی نکلوں گا۔ اس طرح حامد نے اپنی روٹین میں تبدیلی لائی اور روز فجر کی آذان سن کر نیند سے بیدار ہوتا، وضو کرتا، نماز پڑھتا اور پڑھائی میں لگ جاتا۔ شام کے وقت بچے کھیلتے رہتے مگر حامد کتابوں میں کھویا رہتا۔ دھیرے دھیرے حامد کی ہونہاری کا چرچا ہونے لگا۔ اساتذہ کی نظر میں محبوب ہو گیا۔

تعلیمی سال کا آخری مہینہ تھا۔ حسب دستور مدرسہ کی طرف سے تحریری و تقریری مقابلہ کے اہتمام کا اعلان ہوا۔ سبھی بچے کھیل کود کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مقابلہ کی تیاری میں

جٹ گئے۔ حامد نے بھی خوب محنت کی۔ محنت رنگ لائی اور بھی طلبہ میں فرسٹ آیا۔ انعامات کی تقسیم کے لیے مدرسہ کی جانب سے ایک بڑے پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں بڑے بڑے علماء کرام، سیاسی و سماجی رہنماؤں نے شرکت کی۔ سب نے حامد کی خوب تعریف کی اور حوصلہ افزائی کی۔ حامد کی اس کارکردگی سے خوش ہو کر ایک سیاسی لیڈر نے نقد دس ہزار کا انعام دیا۔ اگلے دن بھی اخبارات میں پروگرام کی نیوز چھپی۔ حامد اپنی تصویر دیکھ کر بہت مسرور تھا اور اسے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ گئی کہ "علم سے بڑھ کر اس دنیا میں کوئی چیز نہیں!"

سالانہ چھٹی میں حامد جب اپنے گھر کے لیے نکلا اس وقت اس کے چہرے پہ خوشی کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے دل ہی دل ارادہ کیا کہ گھر پہنچتے ہی یہ پیسے اور انعامات امی ابو کو دے کر کہوں گا: "امی پاپا! میں فرسٹ آیا۔"

حامد جب گھر پہنچا تو ماں پہلے سے ہی اپنے لاڈلے کی واپسی کے لیے آنکھیں بچھائے دروازے پہ منتظر تھی۔ ماں نے آگے بڑھ کر بیٹے کا استقبال کیا اور فرط جذبات سے لپٹ گئی۔

والد صاحب مزدوری کر کے شام کو گھر لوٹے تو حامد نے خوشی خوشی اپنے انعامات والد کے قدموں میں ڈال کر کہا: "پاپا! بھی طلبہ میں فرسٹ آیا ہوں۔"

باپ نے خوشی سے بیٹے کی پیشانی چوم لی اور کہا: "بیٹا! ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔"

میری نیک دعائیں اور خواہشات ہمیشہ تمہارے ساتھ ہیں۔

■

Mohd Akram Zafeer
West Champaran
Mob.: 7250130884

ماں

ماں اللہ کا نہایت قیمتی تحفہ ہے۔
ماں کی خوشی میں اللہ کی خوشی ہے اور اس کی ناراضگی اللہ کی ناراضگی ہے۔
ماں کی محبت پھولوں سی نرم اور شبنم سی ٹھنڈی ہوتی ہے۔
ماں کا عزم چٹان جیسا مضبوط ہوتا ہے۔
ماں کی خدمت میں سکون ہے۔
ماں کی دعا کا مقابلہ کوئی شے نہیں کر سکتی۔

■

Noorash Sahar Bismillah Khan
Class: VIII (A)
Millat High School, Mehroon, Jalgaon (MS)

آؤ اردو سیکھیں

بچو! اس شمارہ میں صرف دو حروف سیکھتے ہیں جو 'دو چشمی ہے' (ھ) کی مدد سے بنتے ہیں۔ یاد رکھیے یہ بھی اردو کی بنیادی آوازوں کو ظاہر کرنے والے حروف ہیں۔

ج + ھ = جھ

چ + ھ = چھ

جھ سے جھنڈا؛ جھنڈ، جھاڑی، جھولا، جھیل

बच्चो! इस शुमारा में सिर्फ दो हुरूफ सीखते हैं जो 'दो चश्मी हे'(ھ)की मदद से बनते हैं। याद रखिए ये भी उर्दू की बुनियादी आवाज़ों को ज़ाहिर करने वाले हरूफ हैं

जीम (ج)+हे (ھ)=झे(جھ)

चे(چ)+ हे(ھ)= छे(چھ)

झे(جھ)से झंडा; झुंड; झाड़ी; झोला; झील

چھ سے چھاتا؛ چھاگل، چھت، چھڑی، چھینی

छे (چھ) से छाता; छागल; छत; छड़ी; छेनी;

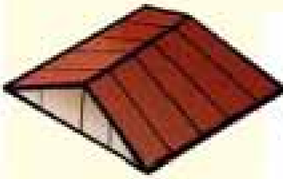

آپ کا دماغ کتنا تیز ہے؟

دوستو! یہ دونوں تصویریں دیکھنے میں تو ایک جیسی لگتی ہیں لیکن تصویروں کی نقل بنانے والے سے ایک دو نہیں بلکہ دس غلطیاں ہو گئی ہیں۔ کیا آپ ان غلطیوں کو تلاش کر سکتے ہیں؟ 10 منٹ میں اگر آپ نے تمام غلطیاں تلاش کر لیں تو سمجھیے کہ واقعی آپ کا دماغ بہت تیز ہے۔

جوابات اسی شمارے میں تلاش کریں

محمد علی اختر احمد

شرارت کا انجام

کسی گاؤں میں دو بھائی رہتے تھے۔ ایک کا نام خالد تھا اور دوسرے کا نام ناصر تھا۔ ناصر بہت ہی شریر لڑکا تھا۔ لیکن خالد بالکل بھی شریر نہیں تھا اور ناصر کی طرح بیوقوف بھی نہیں تھا۔ وہ تو عقل مند اور نیک بچہ تھا۔ اپنی جماعت میں ہمیشہ اول آتا تھا۔ وہ خود ناصر کو ڈانٹتا، ٹوکتا، نصیحت کرتا مگر سب بے سود۔

ناصر کبھی کسی کتے کو پتھر مار کر زخمی کر دیتا تو کبھی کسی اندھے فقیر کی لاٹھی چھین لیتا۔ یا پھر پڑوس کے رامو کسان کے یہاں جا کر اس کی مرغیوں کے چوزوں کو ہوا میں گیند کی طرح اچھال دیتا اور مرغیوں کے انڈے چرا کے لے جاتا۔

رامو کسان ان کا پڑوسی تھا جس کے پاس تھوڑی سی زمین تھی اور دو مرغیاں تھیں۔ دونوں سفید تھیں۔ جن کے انڈوں کی ناصر چوری کرتا تھا اور گھر آ کر کہتا کہ بازار سے خرید کر لایا ہوں۔

اس کے علاوہ ناصر کی اور ایک شرارت تھی کہ وہ خالد کو چشمش چشمش کہہ کر چڑاتا کیونکہ خالد کو چشمہ لگا ہوا تھا۔

ایک مرتبہ ناصر اور خالد اسکول سے گھر آ رہے تھے کہ اچانک ناصر کو کیا سوجھی وہ خالد کی طرف دیکھ کر اسے چشمش چشمش کہہ کر چڑانے لگا۔ مگر بدقسمتی سے اس کے راستے میں ایک پتھر آ گیا جس سے لڑکھڑا کر وہ گر پڑا۔ خالد نے اسے اٹھایا۔ اس کے ہاتھ میں معمولی سی چوٹ آ گئی تھی۔ خالد اُسے اٹھا کر گھر لایا۔

گھر آ کر مرہم پٹی بھی خالد ہی نے کی اور کہا "تھوڑی دیر آرام کر لو پھر ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

ایک مرتبہ گاؤں میں طوطے بیچنے والا آیا۔ ناصر اس وقت باہر کھیل رہا تھا۔ طوطے والے کو دیکھ کر ناصر اور اس کے دوست طوطے والے کی طرف بڑھے اور سب طوطے والے کے پاس پہنچے۔ کچھ بچے طوطا خرید کر لے جانے لگے۔ ناصر کے دل میں بھی طوطا خریدنے کا شوق پیدا ہوا۔ وہ گھر کی طرف دوڑا گھر آ کر امی سے کہا "امی مجھے پیسے چاہیے" امی نے پیسے مانگنے کی وجہ پوچھی "کیا کام ہے تمھیں پیسوں سے" ناصر نے جواب دیا "امی دیکھو نا بہت سے بچے طوطا خرید کر لے جا رہے ہیں۔

مجھے بھی طوطا چاہیے" ناصر کی بات سن کر امی نے ناصر کو سمجھایا "بیٹا طوطے آسمان میں اڑتے ہوئے اچھے لگتے ہیں۔ بے بس پرندے کو اور قید کی مت جاؤ بلکہ اسے اوپر اڑا دو۔

امی کی بات سن کر ناصر رو پڑا اور بولا "امی مجھے طوطا ہر حال میں چاہیے۔ امی نے ناصر کو پیسے دے دیے کیونکہ ناصر کسی حال میں ماننے کو تیار نہیں تھا۔

پیسے ہاتھ میں لیتے ہی ناصر خوشی سے اچھلا اور پھر دوڑتا ہوا طوطے والے کے پاس پہنچا۔ طوطا لیا اور گھر آیا شام کو جب ابا گھر آئے تو ناصر نے ان سے پنجرے کی مانگ کی۔ ابا بازار سے پنجرہ لے آئے اور پھر طوطا پنجرے میں قید ہو کر رہ گیا۔

پہلے دن تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی چلا لیکن دوسرے دن اسکول سے آتے ہی ناصر کو شرارت سوجھی۔ اس نے طوطے کو پنجرے سے باہر نکالا۔ دھاگے کا ایک سرا طوطے کے پیر میں باندھا اور دوسرا سرا ہاتھ میں پکڑا اور طوطے سے بولا "کیوں میاں طوطے اڑنے کے لیے تیار ہو۔" یہ کہہ کر ناصر طوطے کو ہوا میں پتنگ کی طرح اڑانے لگا۔ پھر جو ہونے والا تھا ہو ہی گیا۔ بیچارے طوطے کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ طوطا پھڑ پھڑانے لگا اور پھڑ پھڑا کر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ کمرے کے پاس سے خالد گزر رہا تھا۔ پھڑ پھڑ کی آواز سن کر خالد کمرے میں آیا۔ طوطے کی حالت دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ یہ ناصر کی شرارت ہے۔ اس نے ناصر سے کہا "ناصر یہ تم نے کیا کیا۔ اس بیچارے بے بس پرندے کی ٹانگ توڑ دی۔ یہ بھی ہماری ہی طرح اللہ کی مخلوق ہے۔ اسے اس طرح پریشان نہیں کرنا چاہیے۔" خالد کی بات سن کر ناصر آگے بڑھا اور بولا "ارے جاؤ بھائی تم کون ہوتے ہو نصیحت کرنے والے۔ مجھے تو مزہ آتا ہے۔" یہ کہہ کر ناصر نے خالد کو دروازے کی طرف دھکا دے دیا۔ تبھی امی دروازے کے پاس سے گزر رہی تھی۔ انھوں نے خالد کو پکڑ لیا اور ناصر سے بولی "ناصر آنے دو تمھارے ابو کو تمھاری شکایت کرتی ہوں۔"

شام کو جب ابا جان گھر پر آئے تو امی نے ناصر کے کان پکڑتے ہوئے کہا "دیکھیے اس شیطان کو بیچارے طوطے کی ٹانگ توڑ دی اور اوپر سے خالد کو دھکا دے دیا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ میں نے پکڑ لیا ورنہ خالد کا کیا حال ہوتا۔ اس رات ناصر کی بہت پٹائی ہوئی مگر چکنے گھڑے کی کھوپڑی پر تلوار کا کیا اثر۔

ایک مرتبہ ناصر نے سوچا کہ کیوں نہ رامو کسان کی مرغی ہی چرائی جائے۔ اس نے طے کیا کہ کل اسکول سے آنے کے بعد مرغی کی چوری کر لی جائے۔

دوسرے دن چھٹی کے بعد ناصر گھر آیا اور اس کے آنگن اور رامو کسان کے آنگن کے بیچ والی دیوار کے اوپر ایک بڑے پتھر کا سہارا لے کر چڑھا اور نیچے کودا۔ اتفاق سے رامو کسان اپنی مرغیوں کو دانہ کھلا رہا تھا۔ ناصر کو دیکھ کر وہ وہیں چھپ گیا۔ ناصر نے مرغیوں میں سے ایک مرغی اٹھائی۔ تبھی رامو کسان باہر نکل آیا۔ اس نے کہا "کیوں ناصر کہاں لے جا رہے ہو اس مرغی کو۔" آواز سن کر ناصر چھٹا مرغی چھوڑ کر دیوار پر بڑی مشکل سے چڑھا لیکن جیسے ہی نیچے کودا وہیں پتھر سے ٹکرایا جس کی مدد سے وہ اوپر چڑھا تھا۔ اس کے ہاتھ پیر بری طرح سے زخمی ہو گئے۔ اسے اسپتال پہنچا دیا گیا۔ ناصر کی شرارتوں کی سزا اسے مل چکی تھی۔ اس نے شرارتوں سے ہمیشہ کے لیے توبہ کر لی۔

■

Mohd Ali Akhtar Ahmad
VI, Maulana Abul Kalam High School
Akkal Kova,
Distt.: Nandurbar - 425414 (Maharashtra)

تحریم تبسم بنت شیخ آصف، درجہ دہم، فاطمہ گرلس ہائی اسکول، بیگم پورہ اورنگ آباد، مہاراشٹر

فاطمہ انجم، درجہ چہارم، بی سنتوسے اسکول، رام پور، یوپی

ناز مین پروین بنت شیخ یوسف، درجہ ہشتم، ضلع پریشد اردو اسکول شیوری، مہاراشٹر

واصفہ توصیف، درجہ نہم، ارسلہ ہائی اسکول، دارونڈ

شاہینہ صدیقی، درجہ ہشتم، شاہ پور، بکسونی، بستی پور، بہار

نیرہ انور بنت کلیم خان، درجہ ہفتم، احمد اکیڈمی اردو گرلس ہائی اسکول، بیاول، ضلع جلگاؤں، مہاراشٹر

ہما منظر شیخ، درجہ ہشتم، ضلع پریشد اردو اسکول سبھاش نگر، تعلقہ شیر پور، مہاراشٹر

سلمان احمد شبیر احمد
درجہ چہارم، مہاراشٹر اردو مڈل اسکول نمبر ۲، آکوٹ، مہاراشٹر

ناہید پروین حسین خان، درجہ ہشتم، اردو مڈل اسکول جل گاؤں، جامود

شاداب خان ریاض خان، درجہ ہشتم، مقصدیہ اردو ہائی اسکول، منگرول، مہاراشٹر

حنا کوثر بخت محمد خان، درجہ ہشتم، نگر پریشد اردو گرلز اسکول، جل گاؤں، مہاراشٹر

ایمن نعیم، جنت میری کانونٹ سیکنڈری اسکول، رام پور، یوپی

اردو فیس بک facebook

میں کشمیر میں رہتا ہوں۔ میں آپ کے اس رسالہ 'بچوں کی دنیا' کا بڑی بے صبری سے انتظار کرتا ہوں۔ یہ رسالہ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ اُمید ہے کہ اس میں اور اچھے اچھے مضامین پڑھنے کو ملیں گے۔

شاکر مستقیمین، سری نگر، کشمیر

میرا نام قاضی محمد عفان ہے۔ میں الھرا اردو پرائمری اسکول بھساول میں جماعت پنجم کا طالب علم ہوں۔ مجھے 'بچوں کی دنیا' بہت پسند ہے کیونکہ اس میں چھوٹی چھوٹی اور اچھی اچھی کہانیاں ہوتی ہیں۔ میں وہ کہانیاں بہت شوق سے پڑھتا ہوں اور اس خوب صورت اور رنگین رسالہ کا ہر ماہ شدت سے انتظار کرتا ہوں۔

قاضی محمد عفان، ڈاکٹر تسلیم، ملت نگر، بھساول، ضلع جلگاؤں، مہاراشٹر

میری عمر 11 سال ہے اور میں کماری آدیان انٹر کالج میں درجہ سات کی طالبہ ہوں۔ میں 'بچوں کی دنیا' کی ابتدائی دور سے قاری ہوں کیونکہ میرے والد محترم جناب حفیظ بن عزیز ایک بہترین شاعر، افسانہ نگار اور مضمون نویس ہیں۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا تو اپنے گھر کا ماحول ادبی اور ادبی پایا بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ ادبا اور علماء کی گود میں میری پرورش ہوئی تو غلط نہ ہوگا کیونکہ والد صاحب کے پاس شہر کانپور اور آس پاس اضلاع کے ادیب و شاعر، علماء اور دانشور اکثر آتے رہتے ہیں شاید ہی کوئی دن ایسا جاتا ہوگا کہ مجھے ابو سے ملنے آنے والوں سے دعائیں نہ ملتی ہوں۔ مجھے بھی لکھنے کا بہت شوق ہے لیکن ابو کہتے ہیں کہ ابھی خوب پڑھو اس کے بعد لکھنا۔

فری فاطمہ، کانپور

ہمارے ابو ایک بار 'بچوں کی دنیا' گھر پر لائے ہم دونوں بہن بھائیوں نے اُسے خوب پڑھا۔ ہم کو بہت اچھا لگا۔ پھر ہم نے ابو سے اصرار کیا تو انھوں نے منگانا شروع کیا۔ اب ہمیں ہر مہینے پابندی سے ملنے لگا اور ہم دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ اس لیے کہ اس میں بہت اچھی اچھی معلومات ملتی ہیں۔ یہ ایک مکمل رسالہ ہے جسے ہر گھر میں ہونا ضروری ہے۔

اقصیٰ زہرا، درجہ سوم، دانش مہدی، درجہ دوم، شعیب اردو اسکول، ممبر

میرا نام محمد تحسین انصاری ہے۔ مجھے بچوں کی دنیا بہت اچھی لگتی ہے۔ میں اپنے ماموں کے گھر جا کر اس کی کہانیاں سنتا ہوں۔ اس کی خوب صورت تصویریں مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔ اس میں ہمارے شہر برہانپور کے بچوں کی تصویریں بھی کئی بار چھپی ہیں۔ میں بھی اس خوبصورت میگزین میں اپنی تصویر دیکھنا چاہتا ہوں۔

محمد تحسین انصاری ابن محمد اصغر بکری والے، سر بکری والا پورہ، ایم پی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

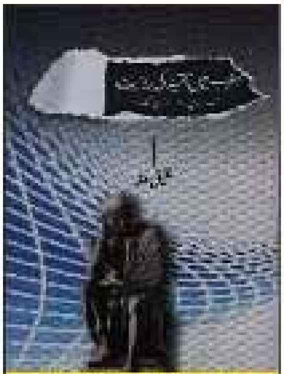

صفحات: 565، قیمت: 245 روپے

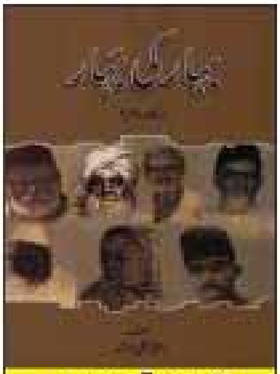

صفحات: 242، قیمت: 150 روپے

صفحات: 440، قیمت: 220 روپے

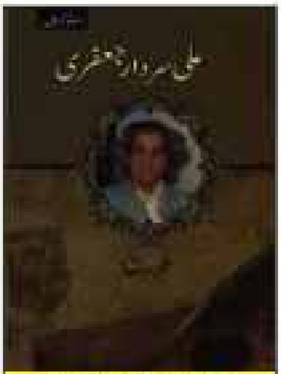

صفحات: 153، قیمت: 90 روپے

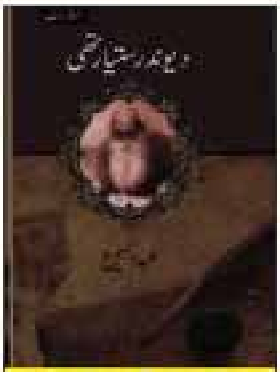

صفحات: 102، قیمت: 90 روپے

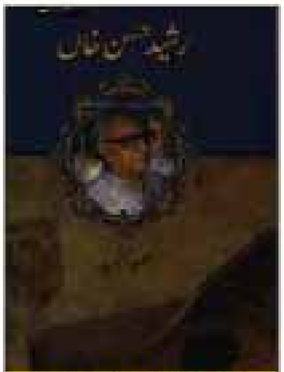

صفحات: 122، قیمت: 74 روپے

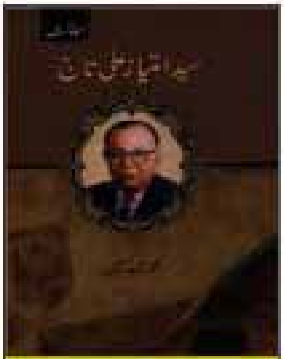

صفحات: 136، قیمت: 60 روپے

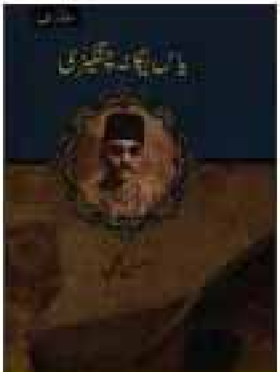

صفحات: 146، قیمت: 90 روپے

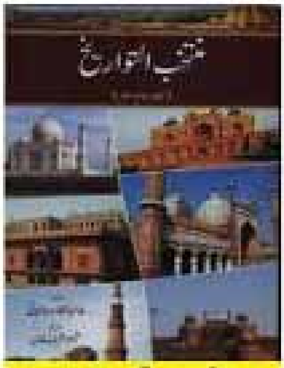

صفحات: 152، قیمت: 75 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159 sales@ncpul.in, E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com

BACHON KI DUNIYA Monthly, September 2017, Vol. 05, Issue: 9
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
DL(S)- 01/3439-2016-18
ISSN 2350-1286
Date of Publication:
Date of Dispatch:

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دلچسپ کتابیں

خریداری کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S. Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II, New Delhi - 110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi -110025.